مقاماتِ تصوّف

تصنیف

اُستاذ العُلماء حضرت مولٰنا الحاج محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ آنند (گجرات)

یونیورسل بکس ۰ ۴۰۔اے اُردو بازار ◎ لاہور

ناشر ــــــــ یونیورسل بکس
۴۰۔ اے اردو بازار لاہور

مطبع ــــــــ جنرل پرنٹرز لاہور

تاریخِ اشاعت ــــــــ ۱۹۸۲ء

قیمت ــــــــ ۲۴ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے اس کتاب کو شائع کرنے کی توفیق دی اور ایک خاص اسلامی اور دینی موضوع پر ایک ایسی کتاب سامنے آئی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچائے اور اس کی اشاعت کا مقصد پورا ہو۔

اس زمانہ میں اخلاق و روحانیت پر چاروں طرف سے مادیت اور شیطنت کا حملہ ہے اور الحاد و بد دینی کا سیلاب ہر طرف سے امڈ امڈ کر انسانی بستی پر تباہی مچا رہا ہے، پریس اور نشر و اشاعت کی آسانی اور زیادتی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسانیت فروشوں نے گندے لٹریچر، مخربِ اخلاق کتابیں، حیا سوز مضامین اور فواحش و منکرات کی ریل پیل کر دی ہے اور عوام ہیں کہ ان گندگیوں پر پیسے خرچ کر کے اپنے دل و دماغ اور ذہن و مزاج کو تباہ کر رہے ہیں، اور اچھی کتابوں سے ہٹ کر گندی چیزوں کے پڑھنے میں لذت پا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اخلاقی اور روحانی بناؤ سنگھار کے لئے مستند اور صحیح کتابوں کی کس قدر ضرورت ہے؟ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے "مقاماتِ تصوف" کی اشاعت اسی داعیہ اور تقاضے کی صدائے بازگشت ہے، اس کے مصنف حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی مستند عالم و مبلغ ہیں اور مدت العمر قوم کے مزاج و ذہن سے واقف رہے ہیں۔ یہ کتاب انھوں نے ان ہی تجربات کی روشنی میں تحریر فرمائی ہے۔ خدا کرے مولانا موصوف کی یہ اصلاحی کوشش ہر طرح بار آور ہو اور مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔

پیش لفظ

از: مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری

اسلام دینِ انسانیت ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو کو بہتر سے بہتر بنانے میں کامیاب ترین دین ہے۔ اور یہ صرف مان لینے کی حد تک نہیں ہے، بلکہ تجربات و مشاہدات کی روشنی میں اور دلائل و براہین کے بل بوتے پر ہزاروں سال سے زندہ و تابندہ ہے۔ اسلام کی تشریف آوری مکارمِ اخلاق، محاسنِ روح، اور معارفِ نفس کی تکمیل و اتمام کے لئے ہوئی ہے تاکہ انسان صرف کھاتا پیتا، جانور ہی نہ رہے بلکہ احسنِ تقویم کا حسین ترین مظہر ہو اور اس کائنات میں قدرت کا بلند ترین شاہکار بن کر اپنی تخلیق کے منشاءِ عبدیت و بندگی کو بہترین انداز میں پورا کرے۔

جو اسلام دینِ انسانیت ہے اور انسانوں کو عبدیت و بندگی کا اعلیٰ ترین مقام دیتا ہے، وہ عقائد اور اعمال کا مجموعہ ہے اور تصدیق بالجنان، اقرار باللسان اور عمل بالارکان کی ہیئتِ ترکیبی پر اسلام کا لفظ بولا جاتا ہے۔ ان عقائد و اعمال میں یقین اور کارکردگی کے ضعف و طاقت کے اثرات نتیجہ کے طور پر کام کرتے ہیں۔ اسلام، ایمان، اور احسان کے الفاظ اسی قسم کی امتیازی حیثیتوں کو ظاہر کرتے ہیں، ورنہ اسلام ایک جامع حقیقت ہے جو ان سب کو شامل ہے۔

اسلام نے ہمیں بتایا کہ انسانیت کا اصل مقام عبادت و رضائے الٰہی ہے، لہٰذا اس دنیا میں انسان جو کچھ کرے اس میں یہی چیز محرک اور بنیاد ہو، اگر زندگی عبادتِ الٰہی اور ذکرِ الٰہی سے خالی ہو تو

اس میں کوئی خوبی نہیں، اسی لئے اسلام انسانی زندگی کے ہر پہلو کو اللہ کی یاد و عبادت سے متعلق کرکے
اس میں خوبی پیدا کرتا ہے، کہیں ذکر و عبادت کا ظہور عملی طور پر ہوتا ہے، کہیں صورت حال سے کام
لیتا ہے اور کہیں وضع و ہیئت اسے بتاتی ہے۔ پھر ایک انسان پر کیا موقوف، اس کائناتِ بلند
و پست کی ہر ہر چیز اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی عبدیت و بندگی اور اس کی یاد میں ہمہ تن مصروف ہے
یہ دوسری بات ہے کہ ہم اس کی تسبیح و تحمید کو سمجھ نہیں سکتے ہیں۔ یہ ہمارا قصورِ علم و تحقیق ہے۔

دوسرے مذاہب اور اقوام و ملل کی طرح اسلام میں ایک زندگی متعدد حیثیات میں تقسیم
ہو کر دینی اور دنیاوی حصوں میں تقسیم نہیں ہے بلکہ اسلامی زندگی صرف ایک ہے اور اسے ایک ہی
معیار پر رہنا چاہیئے۔ تاکہ اس کے تمام پہلوؤں سے چاہے ان کا تعلق دین سے ہو چاہے دنیا سے۔
یکرنگی و یکسانیت کا ظہور ہو، ہمارے یہاں تزکیۂ روح و نفس تزکیۂ اخلاق و کردار سے الگ نہیں ہے
اور اصلاحِ نفس، اصلاح انسانی کی دوسری تعبیر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان
اللہ علیہم کی مقدس زندگیاں اسلام کو جانچنے اور پرکھنے کی کسوٹی ہیں۔ ان حضرات کی زندگی عبادتِ
الٰہی اور ذکرِ الٰہی سے معمور و منور تھی مگر اس میں دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں نہیں تھیں بلکہ دینی زندگی
دونوں کو حاوی تھی۔

حضرات تابعین و تبع تابعین، اور حضرات فقہاء و محدثین رحمہم اللہ نے اسلام کی اس حقیقت
کو اپنی زندگیوں سے پیش کیا کہ وہ دین و دنیا کے جامع تھے، اور ان کے یہاں کوئی فرق نہیں
تھا بلکہ ورع و تقویٰ، زہد و عبادت، اور خدا ترسی و خدا پرستی ان کی ہر ہر بات میں عام تھی، اور
ان کو احسان کا وہ مقام بلند حاصل تھا جس سے وہ ظاہر اور باطن میں جہاں بھی ہوں اور دین اور
دنیا جس کا بھی معاملہ ہو اس میں اس انداز سے حصہ لیتے تھے کہ گویا ہر حرکت و سکون میں اللہ سبحانہٗ کی
جناب میں مسئول اور جوابدہ بنکر کھڑے ہیں اور وہ ان کی ایک ایک بات کو دیکھ رہا ہے۔ اسی مقام

احسان پر فائز ہونے کی وجہ سے خیر القرون کے خلاصۂ انسانیت کہلانے والے یہ حضرات صرف اپنے دور کے نہیں پورے انسانی دور کے بہترین لوگ قرار پائے۔ تیسری صدی ہجری تک تصوف کوئی الگ اصطلاح اور اصول و مبادی نہیں پیدا کر سکا تھا بلکہ علمائے امت، ائمہ اسلام اور بزرگانِ دین کی مقدس زندگیاں جادۂ شریعت پر دینی رہنمائی کی منزل تھیں جنکی اسلام نے تعلیم دی ہے، اور جس پر چلنے کی خبر صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں دی ہے:

انی ترکتکم علی ملۃ بیضاء لیلھا ونھارھا سواء — یعنی میں نے تم لوگوں کو ایسی روشن شاہراہ پر چھوڑا ہے جس میں رات اور دن دونوں برابر ہیں

یعنی شریعت اسلامیہ پر چلنے سے انسان ہر نشیب و فراز اور خطرہ سے بچکر سلامتی کیساتھ عبدیت کی منزلِ مقصود تک جا سکتا ہے۔ اور اسلاف رحمہم اللہ نے اسی جادۂ مستقیم اور راہِ قویم پر چلکر سب کچھ حاصل کیا جو انسانی عظمت و کرامت کیلئے ممکن تھا۔

اسلام میں یہی زندگی، دینی زندگی، تقویٰ، طہارت کی زندگی اور احسان و تصوف کی زندگی کہلاتی ہے، تصوف اسلام سے ہٹکر کوئی الگ نظام فکر و عمل نہیں ہے اور نہ ہی دوسرے مذاہب کی تجردیت و رہبانیت کی طرح اسمیں کوئی فلسفہ اور عقلیت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ بعد کے ادوار میں تصوف کو ایک مستقل نظام فکر و عمل کے انداز میں پیش کیا گیا اور بعض خاص دینی افکار و عقائد کی ذوقی اور وجدانی تعبیر کی گئی پھر بھی اسے شریعت سے مستقل اور الگ نہیں سمجھا گیا بلکہ تصوف کو اصلاح نفس و اخلاق کے سلسلے میں اسلام کا ایک شعبہ سمجھا گیا اور اسمیں وہ ممتاز و مخصوص شخصیتیں پیدا ہوئیں جنھوں نے اس راہ سے اسلام کی خدمت فرمائی۔

یہ کتاب مقاماتِ تصوف اسی شعبۂ اصلاح نفس و اخلاق کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے اسمیں احسان و تصوف نہایت پاکیزہ انداز میں پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تصوف دین و شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے اور نہ کسی حال میں اسلامی احکام و شرائع سے مستغنی ہو سکتا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے تصوف کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے جن کو آخر دور میں نیادار متصوفین نے ایجاد کر رکھا تھا اور شریعت و طریقت

کو مجدد اعید امان کر طرح طرح کی خرابیاں پیدا کی تھیں۔

چونکہ راقم احسان و تصوف کے مقام بلند کی لذت سے محروم ہے اسکے بارے میں کوئی بات کرنا بھی میرے لئے مناسب نہیں ہے اس لئے میں اس کتاب کے معنویات کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہوں البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ میں نے ایک مرتبہ پوری کتاب غور سے پڑھی ہے اور مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مجھے بہت ہی خوب معلوم ہوئی ہے ہو سکتا ہے کہ بعض بعض مقامات پر انداز بیان اور طرز ادا بعض بعض اذہان اور اذواق کیلئے اختلاف رائے کا باعث بن سکیں مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اصلاح نفس کے مباحث میں یہ کتاب بہت مفید ہے۔

اس کے مصنف استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی سابق معلم حدیث مدرسہ قاسمیہ شاہی مراد آباد (حال شیخ الحدیث جامعہ عربیہ الگجرات) ہمارے ان جانے پہچانے بزرگوں میں سے ہیں جن کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ مولانا نے زندگی بھر اسلام اور مسلمانوں کی خدمت مختلف انداز سے فرمائی ہے۔ کامیاب مدرس کامیاب خادم ملک و قوم اور کامیاب مربی و مصلح کی حیثیات انکی جامع شخصیت کو متعارف کرانے کے لئے کافی ہیں۔ اس کا اندازہ خود مولانا موصوف کے اپنے تعارفی مقدمہ سے ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور دین و دنیا کی کامیابی دے۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

قاضی اطہر مبارکپوری، بمبئی

لیلۃ القدر ۱۳۸۳ھ

فہرست مضامین

باب اول

باب دوم

باب سوم

باب ششم

باب ہفتم

عرضِ حال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونومن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیات اعمالنا من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ ونشھد ان محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللہ علیہ وعلٰی آلہ واصحابہ وسلم

"اسلام میں تصوف" ایک اہم علمی موضوع ہے جس پر یہ تالیف پیش کی جارہی ہے۔ اصل کتاب اور اس کی وجہ تالیف تک پہونچنے سے پہلے اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مؤلفِ کتاب کو اس خاص علمی موضوع سے کیا مناسبت ہے اور اس راہ میں کاوشِ فکر وقلم کا کہاں تک حق پہونچتا ہے تو یہ ایک قدرتی بات ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس سوال کے جواب میں اور بطور اظہارِ نعمتِ الٰہی وضاحت کی غرض سے اگر ابتدا میں کچھ اپنے متعلق بھی گذارش کردیا جائے تو شاید بے محل نہ ہوگا۔

لہٰذا بطور اظہار تشکر و تحدیث نعمت کے عرض ہے کہ بحمد اللہ راقم السطور کو شروع ہی سے نیک حلقوں اور صحبتوں کی سعادت حاصل رہی۔ مروجہ دینی نصاب تعلیم کی تکمیل اس مرکز علوم و فضائل "دار العلوم دیوبند" میں اس زمانے میں ہوئی جبکہ دار العلوم کی فضائیں علماء و فضلائے امت

اور شیوخِ وقت کی ضوفشانیوں سے جگمگا رہی تھیں اور جو بھی خوش نصیب ذرات اپنے عہد کے اُن آفتاب و ماہتاب کے سامنے آگئے اُن میں بھی ایسی چمک پیدا ہو گئی جو ان بے بساط ذروں کے لئے معراجِ کمال ہی کہی جا سکتی ہے۔

ان ہی فضاؤں میں راقم السطور نے خاتم المحدثین حضرت الاستاذ علامہ محمد انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہٗ العزیز کے سایۂ فیض و شفقت میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور جب اپنے مستقبل کے بارے میں حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ سے رجوع کیا تو حضرت موصوف نے خدمت درس و تدریس کی ہدایت اور ساتھ ہی ذکر و شغل کے سلسلہ میں پاس انفاس کی تلقین سے دستگیری فرمائی، حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ کا کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ سنِ فراغ ۱۳۴۲ھ ہی میں خود ہی ہندوستان کی ایک مشہور و معروف درسگاہ جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں خدمتِ تدریس پر مامور اور متعین فرما دیا اور درحقیقت یہ حضرت اقدس ہی کی مخصوص توجہ اور فیض رسانی کا اثر اور ثمرہ تھا کہ میں اُس وقت سے مسلسل بائیس سال تک مدرسہ شاہی میں خدمت درس کی سعادت سے بہرہ مند رہا۔

اسی کے ساتھ ساتھ حق تعالیٰ کی کرم فرمائیوں نے اور بھی یوں دستگیری فرمائی کہ دار العلوم اور مدرسہ شاہی کے تعلق سے جلد ہی آستانۂ مدنی زبدۃ السلف و قدوۃ الخلف مولائی و مرشدی حضرت الحاج الحافظ الشیخ مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز حنفی چشتی صابری نظامی نقشبندی قادری سہروردی میں نہ صرف شرف باریابی حاصل ہوئی بلکہ بیعت طریقت وارشاد کا دامن بھی ہاتھ آیا۔ اور حضرت اقدس کی شفقتوں اور عنایتوں نے مسلسل اسطرح نوازا جو اپنی استعداد و اہلیت سے کہیں زیادہ، محض حضرتِ اقدس کی عنایت خاصہ اور توجہ عالیہ کا کرم تھا کہ متعدد بار سلہٹ میں ماہ رمضان المبارک حضرت کی صحبت میں

گزارے نیز ۱۹۳۵ء میں سفر حج بیت اللہ میں خدمت و معیت کی سعادت نصیب ہوئی۔ ۱۹۴۲ء میں کم و بیش چھ ماہ تک مراد آباد جیل میں کفش برادری اور خدمت گزاری کا زرین موقع ملا۔ احقر کے جیل پہونچتے ہی حضرت نے تمام رفقاء جیل کے کھانے پینے کے انتظامات پر مامور فرمادیا، اور فرمایا کہ مالٹا میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ یہ خدمت میں خود انجام دیتا تھا، اور یہاں تجھے انجام دینی ہے۔

۱۹ محرم الحرام ۶۲ھ کو حضرت اقدس کا تبادلہ مراد آباد جیل سے الہ آباد کیلئے ہوگیا۔ اسی روز علی الصبح جبکہ میں حسب معمول رفقاء اسیری کے لئے چائے ناشتہ کی تیاری میں مشغول تھا کرم و عنایت کی ایک اور بارش ہوئی اور حضرت اقدس نے ہر چہار طریق تصوف میں بیعت و ارشاد کا قرطاس اجازت مرحمت فرمایا۔ یہ ایک بڑی سعادت تھی اور ساتھ ہی بوجھل ذمہ داری بھی، جس نے عقیدت و ارادت کے رشتوں کو اور بھی مستحکم کردیا۔ یوں میں نے تقریباً تیس سال مسلسل خلوت و جلوت اور سفر و حضر میں حضرت اقدس کے سایۂ شفقت میں گزارے اس طویل عرصہ میں بارہا تصوف و سلوک کے اسرار و مطالب پر حضرت اقدس کے ارشادات سننے کا موقع بھی ملا۔ معمولات کا مشاہدہ بھی کیا اور وقتاً فوقتاً مختلف شکوک و شبہات پر حضرت سے رجوع بھی کیا۔ ایک طرف مرشد وقت سے یہ مسلسل تعلق اور دوسری طرف اپنے رجحانات اور ذہنی تقاضوں کی بناء پر اس راہ کے اکابر متقدمین و متاخرین کے احوال و اقوال کا مطالعہ جاری رہا۔ بالخصوص حضرت امام غزالیؒ۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ۔ حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ وغیرہ کے اقوال

ارشادات سے کے مطالعہ اور پھر کتاب و سنّت میں غور و فکر نے اس موضوع مبارک سے طبیعت کو ایک ایسا لگاؤ بخشا کہ یہی موضوع ذہن و فکر کی توجہ کا خاص مرکز بنکر رہ گیا۔

یہی پس منظر اس تالیف کا داعی ہے۔ اور اس اہم علمی اور دینی موضوع اور اس کی اہمیت و افادیت سے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور غیر معقول افکار کو دیکھتے ہوئے دل نے تقاضہ کیا کہ میں اپنی بساط کے موافق معلومات و مشاہدات کا ایک مجموعہ مرتب کر کے اصحاب ذوق کی خدمت میں پیش کر دوں۔

پیش نظر صفحات دل کے اسی تقاضہ کی تعبیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو نافع خلق بنائے اور ایک بندۂ ناچیز کی اس جراءت خلوص کو شرفِ قبولیت سے نوازے!

اِنَّہٗ بِعِبَادِہٖ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ

ننگِ خلائق محمد اسمٰعیل سنبھلی غفرلہ اللہ

حال وارد بمبئی، یکم ربیع الثانی ۱۳۸۳ ہجری

وجہ تالیف

سب سے پہلے یہ سمجھنے کے لئے کہ سلوک اور تصوف کیا ہے؟ اس کے لئے سید الطائفہ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب عوارف المعارف کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ سئل ابو محمد الجریری عن التصوف فقال الدخول فی کل خلق سنی والخروج عن کل خلق دنی

ابو محمد جریری سے سوال کیا گیا کہ تصوف کیا ہے (فرمایا اخلاق حسنہ کو اختیار کرنا اور اخلاقِ رذیلہ کو ترک کرنا)

۲۔ وقال جنید و قد سئل عن التصوف فقال ان تکون مع اللہ بلا علاقۃ

(حضرت جنید فرماتے ہیں کہ تصوف حق تعالیٰ کے ساتھ بلا کسی غرض کے تعلق کا نام ہے)

۳۔ قال ابو حفص التصوف کلہ آداب لکل وقت ادب ولکل حال ادب ولکل مقام ادب

ابو حفص کہتے ہیں کہ تصوف مؤدبانہ زندگی کا نام ہے، ہر وقت ہر حال اور ہر مقام کے لئے ادب ہے۔

۴۔ وقال رُویم التصوف استرسال النفس مع اللہ علی ما یرید

رویم فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ میں ڈال دینے کو کہ وہ جو چاہے کرے تصوف کہتے ہیں۔

۵۔ وقال جنید الصوفی — حضرت جنید فرماتے ہیں کہ صوفی
کالارض یطرح علیها کل — زمین کی طرح ہے کہ اس پر گندگیاں ڈالی جاتی
قبیح ولا یتحرك — ہیں مگر وہ بے حس و حرکت رہتی ہے۔

(ان تمام اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کامل مخلصانہ اور مؤدبانہ بندگی و عبدیت کا نام تصوف ہے اور جس راستہ پر چلکر یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے اس کا نام سلوک ہے۔)

مرشدی و مولائی حضرت مدنی نور اللہ مرقدہ ارشاد فرماتے ہیں:

آقائے نامدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان تعبد اللہ کانك تراه فان لم تکن تراه فانه یراك۔

کہ احسان نام ہے اس چیز کا کہ تم خدا کی عبادت مکمل خشوع وخضوع کے ساتھ انجام دو اور اس طرح عبادت کرو جس سے ظاہر ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو، جیسے غلام اپنے آقا کو دیکھتا ہے تو نہایت توجہ سے کام کرتا ہے۔ اور کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا، ہر عبادت کی تکمیل اس طرح کرو جیسے تم اپنے آقا و مالک کو دیکھنے کے وقت کرتے ہو۔ اسی مقام احسان کے حاصل کرنے پر تصوف کا تمام تر مدار ہے۔

آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں حضورؐ کی مجلس میں ایمان کے ساتھ حاضر ہوتے ہی احسان حاصل ہو جاتا تھا۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی قوت اتنی قوی تھی کہ جو حاضر ہوتا تھا اس کو حق تعالیٰ کی طرف سے توجہ ہو جاتی تھی لیکن آپ کے زمانہ کے بعد صحابہ کرام تابعین تبع تابعین اور مشائخ و اولیاء اللہ کی صحبت اختیار کئے بغیر مرتبہ احسان حاصل کرنا نہایت ہی دشوار بلکہ ناممکن تھا۔ لہٰذا طالبانِ مولیٰ نے ان مبارک صحبتوں اور مجالس حسنہ کو اختیار کیا اور مرتبہ احسان حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کے سچے اور مخلص

بندے بنے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے جس سے سوائے ہٹ دھرم کے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

صحبتِ صالح ترا صالح کند   صحبتِ طالح ترا طالح کند

نیک صحبت تجھے نیک بنا دیگی   اور بُری صحبت تجھے خراب کر دیگی

جس طرح وہ زمین جس پر گلاب اور چنبیلی کے پھول گرتے ہیں، معطر اور خوشبودار ہو جاتی ہے بالکل اسی طرح اولیاء اللہ کی توجہات اور صحبت سے انسان کی زندگی سچے اور مخلص بندہ کی زندگی بن جاتی ہے اور اس میں اخلاقِ رذیلہ ختم ہو کر اخلاقِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے مشائخ اور اولیاء اللہ نے ذکر اللہ، مراقبہ اور چلہ کشی کو ضروری امر تجویز کیا ہے۔ لہٰذا ان اذکار واشغال کو ہرگز لغو اور بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا۔ درحقیقت اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام نے ان اعمال کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غارِ حرا اور رمضان المبارک کی معتکفانہ حیاتِ طیبہ سے اخذ کیا ہے اسی طرح سلسلۂ بیعت کے متعلق حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"بیعت کوئی نئی چیز نہیں ہے قرآن و حدیث میں بہت سے واقعات ذکر کیے گئے ہیں جن سے بیعت کا ثبوت ملتا ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے یہ سلسلہ اب تک چلا آ رہا ہے بیعت اس بات پر ہوتی ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے حکموں کی تعمیل کریں گے۔ اللہ کا ذکر کریں گے اور شریعت پر کاربند رہیں گے اور اسی کو بیعت طریقت کہا جاتا ہے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں کہ ابتدا سے اللہ تعالیٰ نے روحانی تربیت کا سلسلہ اس طرح قائم کیا ہے کہ ایک شخص فیض دیتا ہے اور دوسرا شخص فیض حاصل کرتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے جانشین حواری یا صحابہ اور پھر ان کے تربیت یافتہ حضرات آئے ہیں اور دنیا ان سے

فیض پاتی ہے، علیٰ ہذا القیاس یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

تصوف اور بیعتِ طریقت کے متعلق اس اجمالی تذکرہ کا مقصد ناظرین کتاب پر یہ واضح کرنا ہے کہ مذہب اسلام میں تصوف و سلوک کس قدر ضروری اہم اور عظیم مقصد رکھتا ہے اور اس کے بغیر کوئی انسان کامل الایمان اور ولی باللہ نہیں بن سکتا اور کسی مرشد کامل سے تعلق قائم کئے بغیر تزکیہ و تصفیہ نفس اور مقامات عالیہ کا حصول مشکل بلکہ عادتاً محال ہے مگر افسوس کہ بہت سے لوگوں نے قصورِ فہم کی بناء پر تصوف کو نہیں سمجھا یا کچھ سمجھا تو اس کا استعمال نہایت غلط طریقے پر کیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف علماء کی جماعت سرے سے تصوف کی منکر ہو گئی اور اس کو ایک لغو اور فضول چیز قرار دینے لگی اور دوسری طرف ایک بہت بڑے گروہ نے ہر بے عملی و بدعملی اور اعمال مشرکانہ و حرکات خبیثہ کا نام تصوف اور سلوک رکھدیا۔

ان نام کے درویشوں اور نام نہاد متصوفین نے تصوف و سلوک کا وہ غلط طریقہ جاری کر رکھا ہے، جو صوفیائے کرام کی مقدس جماعت اور مشائخ عظام کے سراسر خلاف اور اصولِ شریعت کے قطعاً مخالف ہے۔ یہ جاہل پیر اپنے مریدین و معتقدین میں طرح طرح کی بدعتیں اور شرکیہ باتیں پھیلا کر تصوف و اہلِ تصوف کو بدنام کرتے ہیں اور ضل فاضل کا مصداق بنتے ہیں مثلاً بعض پیر اپنے مریدوں کو بجائے ذکرِ خدا کے اپنے نام کی تعلیم اور تلقین کرتے ہیں حتیٰ کہ اپنا فوٹو اور مجسمہ اپنی مریدوں کے گھروں میں رکھواتے ہیں۔

بعض جاہل طواف و سجدہ جو خدا اور بیت اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ اپنے اور مزاراتِ اولیاء اللہ کے لئے جائز قرار دیتے ہیں۔ بعض ناواقف پیر اہلِ قال، اولیائے حال کی نقل کر کے ہمہ اوست ہی کی تلقین و تعلیم دیتے ہیں۔

بعض پیر بن کر عورتوں کو بے پردہ بیعت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو باپ بیان کر کے کبھی

بھی پردہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ حالاں کہ پیر سے بھی پردہ فرض ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو صرف زبانی اقرار لے کر بیعت فرمائی ہے۔

بعض خود غرض پیر اپنا نذرانہ وصول کرنے کے لئے اپنے مریدوں پر ناجائز دباؤ ڈالتے ہیں اور مرید کے ماں باپ اور بیوی بچوں کے حق سے اپنا حق مقدم بتلاتے ہیں۔

بعض نا اہل پیر چند خوابوں اور سرور وظیفہ کی بنا پر اپنے مریدوں کو اعلیٰ مقامات پر پہونچنے کی خبر سنا کر اپنا خلیفہ بناتے ہیں حالاں کہ نہ وہ خود ذکر قلبی رکھتے ہیں اور نہ ان کے مرید۔ اور یہ ولایت کا پہلا سبق ہے جس طرح قرآن مجید پڑھنے کے لئے الف با تا ثا بچوں کو شروع کرایا جاتا ہے، جب یہ بے چارے ولایت کی ابجد تک سے بے خبر ہیں تو پھر ولایت کجا ع "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق بنتے ہیں۔

بعض گمراہ پیر اپنے مریدوں سے کہتے ہیں کہ میدانِ محشر میں ہم تمہاری شفاعت کرینگے۔ حالانکہ خود ان کو اپنے جنتی اور جہنمی ہونے کی خبر نہیں۔

حضرت شاہ بوعلی قلندرؒ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

میکنی از مکر عالم را مطیع	میدہی تسکین منم فردا شفیع
تو مکر سے دنیا کو اپنا پیرو بنائے ہوئے ہو	تسکین دیتا ہے کہ میں محشر میں تمہاری شفاعت کرونگا
اے مخنث نہ تو مردی نہ تو زن	مثلِ شیطان راہِ مرداں را مزن
اے مخنث نہ تو مرد ہے اور نہ عورت	شیطان کی طرح لوگوں کو گمراہ مت کر

الغرض ایک طرف یہ جاہل اور پیشہ ور صوفیا جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعاً بے بہرہ تھے یا کافی واقفیت نہ رکھتے تھے۔ راہ اعتدال و صراط مستقیم کو چھوڑ کر افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ اور عقائد باطلہ و اعمال فاسدہ کو مذہب میں شامل

کر کے اپنے مریدوں کو ان پر معتقد ہونے اور عامل بننے کی ہدایت کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اگر کسی بندۂ خدا نے ان بدعات و منکرات اور لغویات سے روکنا چاہا تو اس کو ظاہر پرست مُلّا۔ مولوی وغیرہ وغیرہ القاب سے یاد کیا گیا۔

اور دوسری طرف علمائے ظاہر جو علم باطن کے نور سے محروم ہیں علم باطن کا انکار کرتے ہیں اور علم طریقت کو جو مغز شریعت، مغز اسلام اور مغز ایمان ہے۔ فضول اور بے اصل سمجھتے ہیں اور اس کے مجتہدین و متبعین پر زبان طعن کھولتے ہیں اور بجائے ان کی تعریف کے مذمت کو اپنا شیوہ بناتے ہیں۔ چنانچہ ابن جوزی جیسے محدث نے نہایت زور وشور سے بڑے بڑے عارفانِ وقت مثلاً حضرت جنیدؒ۔ حضرت شبلیؒ اور شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہم جیسے آئمہ طریقت پر حملہ کر دیا ہے اور ان کے حق میں کہہ دیا کہ ولعمری لقد طوی ھٰؤلاء بساط الشریعۃ طیا فیا لیتم لم یتصوفوا۔ مجھے اپنی جان کی قسم کہ ان لوگوں یعنی صوفیوں نے شریعت کی بساط کو لپیٹ دیا ہے کاش کہ یہ لوگ تصوف کو اختیار نہ کرتے اور حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ تجاوز کیا ہے۔

نیز ان علمائے ظاہر کی ایک جماعت نے ان حقائق کا بھی انکار کر دیا ہے جن کی اصلیت پہاڑ سے بھی زیادہ مضبوط اور مستحکم ہے اور انھوں نے بزعم خود صوفیائے کرام کی جماعت کو مخالف شریعت قرار دیا ہے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اہل علم نے اپنے خیال میں کسی نہ کسی حجت شرعی کی بناء پر انکار کیا ہوگا۔ تب بھی ان کی یہ حجت کسی طرح معتبر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسے امور میں اختلاف کرنا جو مقام ولایت سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً کشف، شہود، الہام و کرامت وغیرہ علمائے ظاہر کا

کام نہیں۔ بلاشبہ علمائے ظاہر کتاب وسنت کے مسائل کی تخریج وتشریح میں عمر گزار دیتے ہیں اور مسلمانوں کو شریعت کے متعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے رہتے ہیں اور وہ یقیناً اپنی اس خدمت کے بدلے حق تعالیٰ کے یہاں اجر عظیم اور ثواب جزیل کے مستحق ہیں مگر مقاماتِ سلوک کی خبر دینا تو مجاہدہ وریاضت، زہد وتقویٰ اور اشتغال ذکر کا نتیجہ ہے۔ اگر علماء ظاہر صرف مقامات سلوک کا علم رکھتے ہیں تو علماء ربانی یعنی اہل اللہ کا ان مقامات پر گزر ہوتا ہے اور اگر انہیں "شنید" حاصل ہے تو ان کو "دید" حاصل ہے اور شنید ودید میں زمین آسمان کا فرق ہے پس منکرین کے محض انکار کر دینے سے اس عالی سلسلہ کی تکذیب نہیں ہو سکتی۔

ہاں یہ بات قابل تسلیم ہے کہ تصوف کی اصل حقیقت بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اکثر نام فروش لوگ شریعت کو چھوڑ کر ایسی باتوں پر زور دینے لگ گئے ہیں جو یا تو سراسر شریعت کے مخالف ہیں یا کم از کم مختلف فیہ ہیں مگر چونکہ عوام الناس ایسی باتوں سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے ان کے ذہن میں یہ بات خوب جم گئی ہے کہ کتاب اللہ اور سنت صحیحہ تو صرف علماء دین کے کام کی ہے اور سلوک طریقت بالکل ایک علیحدہ چیز ہے۔ حالانکہ یہ سراسر گمراہی اور غلطی ہے کیونکہ جو شخص شریعت کے کسی حکم کی مخالفت کرتا ہے اس کو اہل طریقت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ سلف صوفیاء کرام کا تو دستور تھا کہ کسی شخص کو جب تک شریعت کے ضروری احکام کا علم نہیں ہوتا تھا اپنی بیعت میں نہیں لیتے تھے۔ اور ان کی مجالس میں سوائے کتاب وسنت کے اور کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔

حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے مکتوبات میں متعدد مقامات پر اس پر زور دیا ہے کہ صوفیائے زماں کو عام مجالس میں سوائے کتاب وسنت کے اور کچھ بیان نہ کرنا چاہیئے۔

کیونکہ ہمارا زمانہ عہدِ نبوی سے بہت بعید ہوگیا ہے اور خیرات و برکات بہت کم ہوگئی ہیں۔ اس لئے محدثات حسنہ ہوں یا سیئہ ان سے بالکل اجتناب لازم ہے، عام طور پر لوگ سنت نبوی کے تارک ہوکر محدثات کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین کی بہ نسبت زمانۂ حال کے صوفیا کی مجالس سے بہت کم لوگ مستفید ہوتے ہیں۔

بات کسی قدر لمبی ہوگئی میرا مقصد اس بحث سے یہ ہے کہ تصوف کے منکر اور اہل تصوف پر طعن و تشنیع کرنے والے علماء ظاہر یا تو اپنے قصور فہم کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ قرآن و حدیث کے جن اسرار و معارف کو اہل حقیقت حاصل کرتے ہیں۔ علمائے ظاہر اپنے قصورِ فہم کی وجہ سے ان کو حاصل کر نہیں سکتے اور اہل حقیقت کے ساتھ ان کو پوری بدظنی ہوتی ہے اس لئے وہ سوائے تکذیب کے اور کوئی چارہ نہیں پاتے یا بعض کے مد نظر نفسانی اغراض ہوتے ہیں اس لئے وہ تعصب و حسد سے انکار کردیتے ہیں۔

نیز بعض لوگ تکبر و غرور کی وجہ سے اہل حقیقت کو خاطر میں نہیں لاتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ تو ہماری طرح ضروریاتِ انسانی میں مبتلا ہیں انہیں یہ مرتبہ کیسے مل گیا۔ پھر اکثر حضرات علما اس خیال میں مبتلا ہیں کہ صرف شریعت کے اوامر و مناہی کا پابند ہونا نفس کے تزکیہ و تصفیہ کے لئے کافی ہے۔ کسی شیخ کامل سے بیعت اور صحبت کا اختیار کرنا اور ذکر، مراقبہ اور چلہ کشی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں محدث اور بعد کی پیداوار ہیں۔ اس خیال کے نتیجہ میں عوام اور جہلا میں مشہور ہوگیا کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور چیز ہے، شریعت کے حامل علماء ہیں اور طریقت کے واقف مشائخ اور صوفیا ہیں۔ اس خیال فاسد نے اگر ایک طرف مسلمانوں کی نظروں میں اتباع شریعت کی اہمیت

گمراہی اور احکام شریعت کی طرف سے بے رغبتی پیدا کردی تو دوسری طرف بہت سے مسلمانوں میں تصوف وسلوک کی طرف سے نفرت پیدا کردی۔

الغرض ایک طرف کتاب وسنت سے بے بہرہ اور ناواقف جاہل متصوفہ راہ اعتدال چھوڑ کر افراط وتفریط میں مبتلا ہو گئے اور عقاید باطلہ اور اعمال فاسدہ کو مذہب میں شامل کر کے تصوف جیسے اہم اور مفید علم کی بربادی کا باعث بنے۔ اور دوسری طرف کچھ علماء اس زعم میں مبتلا ہیں کہ جو کچھ کتابوں کے ذریعہ ہمارے پاس ہے وہی مکمل دین ہے اور ہمارے لئے کافی ہے۔ ہم کو صوفیائے کرام کے پیش کردہ نظام تصوف کی مطلق حاجت نہیں ہے۔ یہ زعم باطل ان کو دینِ حق کے اس اہم شعبہ سے سراسر محروم کر رہا ہے۔ جس کا تعلق تزکیۂ نفس اور احسان واخلاص جیسی اعلیٰ روحانی وقلبی کیفیات سے ہے۔

جاہل متصوفین، نام نہاد درویشوں اور نور باطن سے محروم علمائے ظاہر کی یہی افراط وتفریط اور غیر معتدل راستہ اختیار کر لینا، درحقیقت اس کتاب کی تالیف کا داعی ہوا ہے میں نے اس کتاب میں اپنی بساط کے مطابق اسلامی تصوف کی حقیقت اس کی اہمیت اور ضرورت پر خاص طور سے روشنی ڈالی ہے اور اسکو ایک مقدمہ، سات باب اور ایک خاتمہ پر مرتب کر کے اس کا نام مقاماتِ تصوف تجویز کیا ہے۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم امين بحق نبيك الكريم عليه الصلوٰة والتسليم وآله وصحبه واولياء امته اجمعين برحمتك يا ارحم الراحمين ؏

مقدمہ

دینِ حق کے تجزیہ سے اس کے تین شعبے معلوم ہوتے ہیں۔

۱ شعبۂ ایمانیات۔ ۲ شعبۂ اعمالِ صالحہ اور ۳ شعبۂ کیفیاتِ روحانی۔ شعبۂ ایمانیات اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات، وحی و رسالت، ملائکہ، قیامت، حشر ونشر، تقدیر، جنّت و دوزخ غیر مشہود اور غیبی امور کو جن کی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے، بلاکم و کاست دل سے ماننا اور تصدیق کرنا۔

دینِ حق کا یہ شعبہ سب سے اہم اور ضروری ہے، یہی پورے دین کی اساس اور بنیاد ہے اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی عمل اور فعل کی کوئی قیمت اور وزن نہیں، یہی شعبہ علم عقائد کا موضوع ہے اور اسی سے اس علم میں بحث کی جاتی ہے۔

شعبۂ اعمالِ صالحہ: دینِ حق کا وہ تمام عملی حصّہ ہے جو اعضاء وجوارح سے تعلق رکھتا ہے جس میں عبادات، معاملات، آدابِ معاشرت، ہجرت، جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر وغیرہ سب داخل ہیں، یہ شعبہ دین کا قالب ہے اور یہی اسلام کا عملی نظام ہے اور ہماری زندگی پر دین کے اسی شعبے کی حکومت ہے علم فقہ کا تعلق اسی شعبے سے ہے یہی اس کا موضوع ہے اور فقہاء دین کے اسی شعبے سے بحث کرتے ہیں۔

۲۳۲۲۶

شعبہ کیفیاتِ روحانیہ: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح ایمانیات، اعتقادات، اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ کے ابواب میں تعلیم و تلقین فرمائی ہے اور اپنے عمل کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح آپ نے حق تعالیٰ کی محبت، خشیت، یقین، توکل، احسان، اور اخلاص جیسی روحانی و قلبی کیفیات کے متعلق بھی اہم ہدایات دے کر ان کو کمالِ دین و کمالِ ایمان قرار دیا ہے اور ان باطنی احوال و کیفیات کا نہایت اعلیٰ اور معیاری نمونہ اُمت کے لئے چھوڑا ہے۔

لہٰذا یہ باطنی و روحانی کیفیات بھی اپنے درجہ میں دین حق کا ایک مستقل اور اہم شعبہ ہیں۔ مشہور حدیث جبرائیل میں پہلے شعبہ کو ایمان، دوسرے کو اسلام اور تیسرے کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے اور آخر میں ان تینوں شعبوں کے مجموعہ کو دین کہا گیا ہے۔ انہ جبرئیل جاء لیعلمکم دینکم (بخاری و مسلم) یعنی یہ جبرئیل تھے جو تمہیں دین کی تعلیم دینے آئے تھے، دین حق کا یہ تیسرا شعبہ تصوف کا خاص موضوع ہے اور صوفیائے کرام اسی موضوع سے بحث کرتے ہیں۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ان تینوں شعبوں کی جامع تھی اور کسی درجہ میں حسب حیثیت و استعداد یہی جامعیت اکابر صحابہ رضوان اللہ عنہم کو بھی حاصل تھی؛ لیکن بعد کے زمانوں میں یہ صورت باقی نہ رہی، بلکہ آپ کے وارثین و نائبین اگرچہ ذاتی طور پر کم و بیش ان تینوں شعبوں کے حامل اور جامع ہوتے تھے، لیکن اپنی اپنی صلاحیت و استعداد اور ذوق یا ماحول کے مطابق انھوں نے کسی ایک شعبہ کی خدمت سے اپنا خاص تعلق رکھا۔ بعد کے قرنوں میں دین کا پھیلاؤ جس درجہ بڑھ گیا تھا اور جو حالات پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں ایسا ہونا ناگزیر تھا اس صورت حال اور تقسیم عمل نے خواص امت میں ائمہ عقائد، ائمہ

حدیث، ائمہ فقہ اور صوفیائے کرام کے الگ الگ طبقے پیدا کر دیئے۔ پس جس طرح ائمہ عقائد و فقہا نے خصوصیت کے ساتھ دین کے پہلے دو شعبوں کی خدمت و حفاظت اور اصول و جزئیات کی تنقیح و تفصیل کی اور علیٰ ہذا جس طرح ائمہ حدیث نے احادیث کی حفاظت اور نقل و روایت کی اہم خدمت انجام دی، اسی طرح حضرات صوفیائے کرام نے دین کے اس تیسرے اہم شعبے کی خدمت و حفاظت اور اس باب میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت کی ہے۔ اس لئے امت پر طبقۂ صوفیہ کا بھی بہت بڑا احسان ہے اور امت یقیناً دین حق کے اس تکمیلی شعبہ میں ان کی خدمت کی ممنون اور محتاج ہے۔

سلوک و تصوف کی اصل غرض و غایت اور صوفیاء کرام کی مساعی کا نصب العین اور خانقاہوں کا موضوع دراصل دین کا یہی تیسرا شعبہ ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بتلائی ہوئی محبت و خشیت اور احسان و اخلاص جیسی روحانی کیفیات کی تحصیل و تکمیل اور پھر اس سلسلہ میں دوسروں کی رہنمائی اور فیض رسانی ان حضرات صوفیاء کا امتیازی شغل اور مخصوص دائرہ عمل ہے۔ لیکن چونکہ باطنی اور روحانی کیفیات صرف کتابیں یا اس سلسلے کے مقالات پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتیں بلکہ ان عام ذرائع سے ان کا صحیح ادراک اور علم بھی نہیں ہوتا اس لئے ان کیفیات کے کسی حامل اور وارث کی صحبت و خدمت میں رہ کر مشاہدہ آثار کی راہ سے ان کی کچھ معرفت ہوتی ہے اور پھر ان کے حصول کے متعلق بھی عام سنت اللہ یہی ہے کہ ان کے حاملین کی صحبت و رفاقت اور تربیت ہی اس کا عام ذریعہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ اس اہم شعبہ سے اکثر محروم اور اس کی معرفت سے قاصر رہتے ہیں۔ جن کو اللہ تعالیٰ کے کسی ایسے بندے کی صحبت و رفاقت کی توفیق نہ ملی ہو، جو ان کیفیات کا حامل ہو۔ جو لوگ اس زعم میں مبتلا ہو جاتے

ہیں کہ جو کچھ کتابوں اور لٹریچر کے ذریعہ ہمارے پاس ہے، وہ دین مکمل ہے۔ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اصل سے محروم رہتے ہیں۔ یورپ کی لائی ہوئی مادی تعلیم اور متصوفین کا غلط تصوف بھی ہم کو دین حق کے اس اہم شعبہ سے محروم کر رہا ہے۔ پس اہلِ حق و حاملانِ سنت نبوی اور شریعت غرہ نے تزکیۂ نفس اور احسان و اخلاص جیسی اعلیٰ روحانی و قلبی کیفیات حاصل کرنے کا جو صحیح نظام تصوف و سلوک کے نام سے پیش کیا ہے، نہایت ضروری ہے کہ ہم اس کو قبول کر کے اس سے فائدہ اٹھائیں۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس اللہ سرہٗ العزیز اپنے مکتوبات کے دفتر اول مکتوب سی و ششم میں فرماتے ہیں، "شریعت را سہ جز است علم و عمل و احسان تا ایں ہر سہ جز متحقق نشود شریعت متحقق نشود چوں شریعت متحقق شد رضا حق سبحانہٗ تعالیٰ حاصل گشت کہ فوق جمیع سعادات دنیویہ و اخرویہ است وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکْبَرُ پس شریعت متکفل جمیع سعادات دنیویہ و اخرویہ آمد۔

طریقت و حقیقت کہ صوفیا باں ممتاز گشتہ اند ہر دو خادم شریعت اند در تکمیل جزو ثالث کہ اخلاص است پس مقصود از تحصیل طریقت و حقیقت تکمیل شریعت است نہ امرے دیگر ورائے شریعت۔ یعنی شریعت کے تین جز ہیں، علم و عمل اور احسان جب تک یہ تینوں اجزا متحقق اور ثابت نہ ہوں گے۔ شریعت متحقق نہ ہوگی جب شریعت متحقق ہو جائے گی تو رضا خداوندی حاصل ہوگی جو تمام دینی و دنیوی سعادتوں سے بڑھ کر ہے اور حق تعالیٰ کی بہت بڑی رضامندی ہے، لہٰذا شریعت ہی تمام دینی و دنیوی سعادتوں کا ذریعہ ہے، طریقت و حقیقت جن سے صوفیائے کرام ممتاز ہیں۔ یہ دونوں دراصل شریعت ہی کے خادم ہیں۔ دین کے تیسرے جزو کے لئے کہ وہ اخلاص ہے۔

لہذا طریقت وحقیقت کے حاصل کرنے سے اصل مقصود شریعت ہی ہے، نہ شریعت کے سوا کوئی اور چیز۔ جہلا میں جو یہ مشہور ہے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور چیز ہے۔ یہ بالکل غلط اور بے دینی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یا تو اتباع شریعت کی اہمیت مسلمانوں کی نظروں میں کم ہو جائے اور ان میں احکام شریعت کی طرف سے بے رغبتی پیدا ہو جائے، معاذ اللہ منہ اور یا یہ کہ تصوف وسلوک کی طرف سے نفرت ہو جائے۔ تصوف کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ غیب کی خبریں معلوم ہونے لگیں جس کو کشف کہتے ہیں۔ نیز اس کا مقصود کرامات اور خرق عادات کا ظہور بھی نہیں بعض سے اس کا صدور ہوتا ہے اور بعض سے نہیں ہوتا جن سے نہیں ہوتا ان کا مرتبہ کم نہیں اور جن سے ہوتا ہے ان کا مرتبہ زیادہ نہیں، نیز اس کا مقصد حق تعالیٰ کا دیدار بھی نہیں ان آنکھوں سے دیدار خداوندی کا وعدہ آخرت میں ہے نہ اس دنیا میں۔

تصوف کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ جن عقائد کی شریعت نے تعلیم دی ان کا یقین پختہ ہو جائے اور وہ امور معلومات کے درجہ سے ترقی کر کے شہودات کے مرتبہ میں آجائیں۔

علم تصوف کی تعریف تصوف وہ علم ہے جس میں ذات وصفات باری تعالیٰ کی نسبت بحث ہوتی ہے اور ان اعمال واشغال کا ذکر کیا جاتا ہے جن سے تزکیہ وتصفیہ باطن ہو جو وصول الی اللہ کا ذریعہ ہے یا یوں سمجھو کہ تصوف، قرآن وحدیث سے نکلی ہوئی ایسی شاہ راہ ہے جو افراط وتفریط کے عین درمیان میں واقع ہے جسے صراط مستقیم کہا جا سکتا ہے اور اس پر چلنے سے انسان خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

موضوع اس علم کا موضوع ذات وصفاتِ الٰہی ہے۔

غرض وغایت علم تصوف کی غرض وغایت معرفتِ الٰہی ہے جس کے لئے یہ انسان پیدا کیا گیا ہے۔

لفظ تصوف کا اشتقاق لفظ تصوف کے اشتقاق میں مختلف اقوال ہیں، بعض نے اس کو لفظ تصوف سے مشتق بتایا ہے جس کی رو سے صوفی صوف پوش کو کہتے ہیں مگر صرف صوف پوش ہونا نہیں، بلکہ اہلِ تصوف کے ظاہری و باطنی آداب سے آراستہ ہونے کا نام تصوف ہے۔

بعض بزرگانِ دین مثلاً شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور امام محمد غزالی نے لفظ تصوف کو صفا سے مشتق قرار دیا ہے۔ پس صوفی باب مفاعلت سے صیغۂ ماضی مجہول صُوفِیَ ہوگا، جو کثرت استعمال سے یا ساکن کے ساتھ صوفی پڑھا جاتا ہے چنانچہ اس شعر سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

وَلَيْسَ يُشْهَرُ بِالصُّوفِيْ غَيْرُ فَتًى صَافِیْ فَصُوْفِیَ حَتّٰى سُمِّیَ الصُّوْفِیْ

عینۃ الطالبین میں فَهُوَ فِي الْاَصْلِ صُوْفِيَ عَلٰى وَزْنِ فُوْعِلَ مَاخُوْذٌ مِّنَ الْمُصَافَاتِ يَعْنِیْ عَبْدًا صَافَاهُ الْحَقُّ عَزَّ وَجَلَّ وَلِهٰذَا قِيْلَ الصُّوْفِيُّ مَنْ كَانَ صَافِيًا مِّنْ آفَاتِ النَّفْسِ خَالِيًا مِّنْ مَذْمُوْمَاتِهَا سَالِكًا بِحَمِيْدِ مَذْهَبِهٖ مُلَازِمًا لِلْحَقَائِقِ غَيْرَ سَاكِنٍ بِقَلْبِهٖ اِلٰى اَحَدٍ مِّنَ الْخَلَائِقِ ۔

یعنی صُوفِیَ دراصل فُوعِلَ کا وزن ہے اور مصافات سے مشتق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ صوفی وہ شخص ہے جس کو حق تعالیٰ نے صاف کر لیا ہو یعنی جو شخص نفس

کی آفتوں اور بُرائیوں سے صاف ہو اور نیک راستہ پہ چلے اور اس کا دل بجز اللہ کے کسی چیز سے آرام نہ پاوے۔

امام غزالیؒ کا قول ہے تجرید القلب للہ واحتقار ما سواہ وھو ماخوذ من الصفا لتصفیۃ القلوب یعنی تصوف دل کو محض اللہ کے لئے یکسو کرنے اور اس کے ماسوا کو حقیر جاننے کا نام ہے اور وہ صفا سے مشتق ہے کیونکہ وہ دلوں کو صاف کرتا ہے۔

حقیقت تصوف لفظ تصوف کے اشتقاق کی بہ نسبت اس کی حقیقت میں اور بھی زیادہ اختلاف ہے کیونکہ حقیقت تصوف کے بہت سے ارکان، شرائط، آداب اور لوازم ہیں۔ کسی نے اس کے کسی جز اعظم کو مدنظر رکھ کر تعریف کی ہے کسی نے اس کے شرائط کو اور کسی نے اس کے آداب و لوازم کو بطور تعریف لفظی کے ظاہر کر دیا ہے مگر ان تمام تعریفات پر جو مختلف مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ سے منقول ہیں، غور کرنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ مقصود سب کا ایک ہی ہے۔ عباراتِ ذیل ملاحظہ فرمائیے۔

التصوف الخروج من کل خلق دنی والدخول فی کل خلق سنی — تصوف تمام اخلاق رذیلہ سے الگ ہونے اور تمام اخلاق فاضلہ سے متصف ہونے کو کہتے ہیں۔

یعنی صحیح عقیدہ اور فرائض و سنن کی پابندی کے بعد تصوف حاصل ہو سکتا ہے، اسی لئے کوئی کافر یا بدعتی مسلمان ایسے اخلاق سے متصف نہیں ہو سکتا۔

التصوف، شغل کل وقت بما ھو الاھم فیہ — اپنے اوقات کو ایسے امور میں بسر کرنا جن کا ان اوقات میں پورا کرنا نہایت ضروری ہے۔

سالک ۔ امور سے مراد ذکر و فکر اور عبادات وغیرہ ہے۔

التصوف۔ الکون مع اللہ بلاعلاقۃ — تمام تعلقات سے الگ تھلگ ہو کر اللہ کے حضور میں حاضر رہنے کو تصوف کہتے ہیں۔

قطع تعلق سے مراد اسباب و وسائل کا دل سے اٹھا دینا ہے نہ کہ اسباب ضروریہ کی ظاہری پابندی سے علٰحدہ ہونا۔

حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں:۔

التصوف۔ ھو ان یمیتک الحق عنک و یحییک بہ و تقطع النظر عن الغیر — اللہ تعالیٰ تجھے اپنی ہستی سے فانی کردے اور اپنی ہستی سے تجھے زندہ کردے اور تو غیر اللہ سے قطع نظر کرے۔

التصوف ھو الجلوس مع اللہ بلا ھم — بلا کسی فکر و تردد کے اللہ کے ساتھ بیٹھنا تصوف ہے۔

التصوف ھو الاخذ بالحقائق والیاس مما فی ایدی الخلائق — حقائق و معارف کے حاصل کرنے اور اہل دنیا سے بالکل ناامید ہو جانے کو تصوف کہتے ہیں۔

التصوف ھو تدریب النفس علی العبودیۃ — تصوف نفس کو لوازم عبودیت کا پابند کرنے کا نام ہے۔

التصوف۔ الوقوف مع آداب الشریعۃ ظاھرًا بیسری حکمھا من الظاھر فی الباطن و باطنًا یسری حکمھا من الباطن فی الظاھر فیحصل للمتادب بالحکمین کمال۔ — تصوف ظاہر و باطن میں آداب شرعیہ کے ساتھ قائم ہونے کو کہتے ہیں۔ اس طرح کہ ان کا اثر ظاہر سے باطن تک اور باطن سے ظاہر تک پہونچ جاوے ؎۔

؎ ان ہر دو جہت پر حاوی ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو کمالِ حقیقی حاصل ہو جاتا ہے۔

التصوف الصدق مع الحق وحسن الخلق مع الخلق — اللہ کے ساتھ صدق برتنے اور خلقِ خدا کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے کو تصوف کہتے ہیں۔

تصوف کی مذکورہ بالا تعریفات کے علاوہ اور بھی بہت سی تعریفیں کتب تصوف میں لکھی گئی ہیں لیکن ان تمام عبارات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف الفاظ کا اختلاف ہے ورنہ مفہوم سب کا ایک ہی ہے۔

یعنی عقاید اہل سنت والجماعت حاصل کرنے کے بعد نفس کو احکام شریعت کا اس قدر پابند بنانا کہ خواہشِ نفسانی کے آثار بالکل دور ہو جائیں اور رفتہ رفتہ حقیقی اطمینان کا درجہ حاصل ہو جائے بجز ذکرِ خدا کوئی چیز اس کو لذت نہ دے اور نہ اس کو اطمینان سے جنبش دے سکے۔ اس حالت کو جب اور بھی زیادہ ترقی دی جاتی ہے تو طہارتِ کلی کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اگر اس درجہ پر پہونچ کر ایسے شخص کا بظاہر تعلق غیر اللہ سے نظر آئے تو یہی سمجھنا چاہیئے کہ وہ اللہ ہی کے لئے ہے یعنی خواہشِ نفس اس کو نہ تو کسی کی مخالفت پر آمادہ کرتی ہے اور نہ محبت پر بلکہ کسی کے ساتھ اس کی مخالفت کرنا غیرتِ ایمانی کا نتیجہ ہوتا ہے اور کسی سے محبت کرنا حکم قرآنی کا اتباع ہوتا ہے۔

الغرض تصوف کا اصل منشا نفس کے آثار کو بالکل محو کر کے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے ارادے و رضا کے تابع کر دینا ہے۔ ایک عارف باللہ کا مقولہ ہے۔

اول شروط الطریقۃ الصوفیۃ تطهیر القلوب بالکلیۃ عما سوی رب البریۃ ومفتاحها جاری منها مجری التحریم من الصلوٰۃ — صوفیائے کرام کے طریقہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دل کا میدان غیر اللہ کی محبت سے بالکل پاک صاف اور محبت الٰہی سے آراستہ ہو جائے اور اس استغراق کو طریقہ سلوک کے ساتھ وہی نسبت ہے

استغراق القلب بذکر اللہ۔ جو تکبیر تحریمہ کو آغاز نماز سے ہے۔
اور پھر اس طریق کی انتہا یہ ہے کہ آثار نفس بالکل محو ہو کر بفحوائے یعنی تخلقوا باخلاق
اللہ اوصافِ الٰہی سے متصف ہو جائے جس کو اصطلاح تصوف میں فنا فی اللہ کہتے ہیں۔

اصطلاحاتِ تصوف

اوپر کی عبارت میں فنا فی اللہ کا اصطلاحی لفظ استعمال ہوا ہے، ضرورت ہے کہ اس کی تشریح کر دی جائے
کیونکہ بعض ناواقف اہل طریقت کی اکثر اصطلاحات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بھی انکار کر دیا
کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا میں کوئی علم و فن آج تک بغیر اصطلاحات کے مروج
نہیں ہوا۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تاریخ، حساب، ہندسہ اور طب وغیرہ سب
کے سب اصطلاحات پر مبنی ہیں کیونکہ اصطلاحات کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بار بار لمبی
عبارت کو دہرانے کے بجائے صرف ایک ہی لفظ سے کام لیا جاتا ہے جس طرح ضمیر (ل) کا
استعمال اختصار کے لئے ہر ایک زبان میں پایا جاتا ہے تصوف بھی ایک علم ہے جس میں مجاہدہ
ریاضت، کیفیات اور واردات قلبی کا ذکر ہوتا ہے۔ دوسرے علوم کی طرح یہ بھی چند
اصطلاحات پر مشتمل ہے جب تک ہم کو ان اصطلاحات کا صحیح ادراک اور علم نہ ہوگا، ہم
اس طریق کے بزرگوں کی گفتگو اور ان کے کلام کو نہیں سمجھ سکتے۔ جو لوگ سلوک طریقت
کے لئے شیخ کامل کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں وہ فنا فی الشیخ اور فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ
ہر سہ اصطلاحات کا استعمال کیا کرتے ہیں اور ان کلمات کا مفہوم۔ کامل اتباع شیخ،
کامل اتباع رسول، کامل تخلق باخلاقِ اللہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم ہرگز
شریعت کے مخالف نہیں کیونکہ جب تک ہم صلاح و تقویٰ کے لئے کامل عملی نمونہ نہ
پائیں افراط و تفریط سے نہیں بچ سکتے۔

بلاشبہ کتاب وسنت سے زہد وتقویٰ کا علم حاصل کرنا اور چیز ہے اور اس کو کسی مردِ خدا یعنی عارف کامل کی عملی حالت سے اخذ کرنا اور بات ہے۔ صورت اول صرف قال ہی قال ہے اور صورتِ ثانی میں قال وحال دونوں ہیں۔ اس کے ثبوت کے لئے زمانہ حال کے علماء کی حالت میں غور کرلو کہ وہ شریعت کے تمام اوامر ونواہی کا علم رکھتے ہیں مگر رذائلِ نفسانی سے قطعاً پاک نہیں ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ ہر ایک شخص عارفِ کامل کی صحبت کے بغیر صرف رسمی عبادت سے تصفیہ وتزکیہ حاصل کرسکتا ہے تو غلط ہے بارہا کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ بہت سے علماء جو علم وفضل میں مسلّم ہیں اور اوامر ومناہی کے پورے پورے پابند ہیں مگر رذائل نفسانی یعنی غصہ، حسد، غرور، حرص، شہوت ریا، بخل، تکبر اور عجب وغیرہ اخلاق ذمیمہ سے وہ ہرگز محفوظ نہیں ہیں۔ برخلاف اسکے ایسے کم علم لوگ بھی ہیں کہ صرف شیخ کامل ہی کی صحبت سے مذکورہ بالا تمام رذائل نفسانی سے بالکل پاک وصاف ہیں۔

تا نیفتد بر تو مردے را نظر
از وجود خویش کے یابی خبر

جب تک کسی کامل کی نظر تجھ پر نہ پڑے۔ تجھے اپنے وجود کی خبر نہیں ہوسکتی۔

ہیچ نکشد نفس را جز ظل پیر
دامن آں نفس کش را سخت گیر

پیر کے سوا اپنے نفس کو کوئی قتل نہیں کرسکتا۔ اس نفس مارنے والے کے دامن کو مضبوط پکڑ۔

گر تو سنگ خارا و مرمر شوی
چوں بہ صاحب دل رسی گوہر شوی

اگر تو سنگ خارا اور مرمر ہوگا تو صاحب دل آدمی کے پاس جاکر موتی بن جائے گا۔

جس طرح کتبِ طب سے استاد کی تعلیم وتجربہ کے بغیر کوئی شخص فائدہ نہیں اٹھا سکتا اسی طرح کتاب وسنت کے علمی وعملی کمال حاصل کرنے کے لئے اساتذہ طریقت

ومشائخ کامل کی ضرورت ہے۔ غرض اصطلاحات کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے بسا اوقات بہت سی حق باتوں کا انکار کر دیا ہے اور جب کسی نے مقابلہ پر کمر باندھ لی تو یہ معاملہ تکفیر و تفسیق تک جا پہونچتا ہے لیکن اگر ضد و تعصب کو چھوڑ کر انصاف سے کام لیا جائے تو کسی کو اس حقیقت سے انکار کی مجال نہیں ہو سکتی، مشہور مقولہ ہے: اذا فہمت المعانی فلا مشاحۃ فی الالفاظ، یعنی جب تو معانی اصلیہ کو سمجھ لے تو ان کو جن الفاظ سے چاہے تعبیر کرلے۔

مگر طعن و انکار کرنے والے کسی قدر معذور بھی ہیں کیونکہ اہل تصوف میں سے بعض کا حال دیکھا گیا ہے کہ انھوں نے احکام شریعت کا کچھ لحاظ نہیں رکھا اور بہت سی بدعات منکرہ کو اس میں داخل کر لیا حالاں کہ طریق تصوف اس قسم کی جعلسازیوں سے بالکل پاک وصاف ہے، وہ شریعت سے کوئی الگ طریق نہیں ہے جس پر کسی قسم کا اعتراض کیا جا سکے۔

طریق تصوف شریعت سے الگ نہیں ہے

مرتبہ حقیقت و معرفت جو درحقیقت تصوف کی غرض وغایت ہے وہ بجز تزکیہ و تصفیہ نفس کے حاصل نہیں ہو سکتا اور تصفیہ و تزکیہ شریعت کی پابندی کے بغیر غیر ممکن ہے، یعنی آدمی ورع و تقویٰ میں یہاں تک استقامت پیدا کرے رخصت سے تجاوز کر جائے، سالک جب اس مرتبہ کو حاصل کر لیتا ہے تو اس پر اسرار احوال منکشف ہونے لگتے ہیں اور یہ طریق عین منشاء شریعت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، ایک بزرگ عارف باللہ کہتے ہیں

کل طریقۃ تخالف الشریعۃ فھی کفر — جو بھی طریقہ شریعت کے خلاف ہے وہ کفر ہے۔

وکل حقیقۃ لا یشھدہ الکتاب والسنۃ فھی الحاد وزندقۃ

اور جس حقیقت پر کتاب وسنت گواہ نہیں ؤ الحاد و زندقہ ہے۔

یعنی طالب صادق کو سب سے پہلے شریعت کے اوامر و مناہی سے آگاہی حاصل حاصل کرنا ضروری ہے پھر تقویٰ وطہارت کی پابندی جس کو طریقت کہتے ہیں اور ان مراتب کے بعد وصول الی اللہ یعنی نور تجلّی کا شاہدہ حاصل ہونا جس کا نام حقیقت ہے۔ درحقیقت یہ تینوں مراتب شریعت ہی کے کمال پابندی کا نتیجہ ہیں یعنی رسم و عادت کے طور پر شریعت کی پابندی سے گزر کر حقیقی طہارت و تقویٰ کو حاصل کرنا جس سے ذکر میں لذت اور لذت سے استغراق ومحویت حاصل ہونے لگے۔ اس بات کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ طہارت شریعت وضو وغسل سے ہوتی ہے اور طریقت ہوائے نفس کے ترک کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور طہارت حقیقت تمام غیر اللہ سے قلب کو پاک کر دینے پر منحصر ہے۔ یہی بزرگ فرماتے ہیں۔

فمن زعم ان العبور من حجب الشریعۃ والوقوف علی اسرار الطریقۃ والحقیقۃ بما یخالف الشریعۃ فقد طغیٰ وغلبت علیہ الضلالۃ والنسیان واستھوتہ الشیطٰن فی الارض حیران حتیٰ اوبقبہ فی اودیۃ الھجران واھلکتہ فی قیعان الخسران۔

جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ آثار شریعت سے گزرنا اور اسرار طریقت وحقیقت پر مطلع ہونا کسی ایسے طریقے سے بھی ہو سکتا ہے جو مخالف شریعت ہے تو ایسا شخص خدا کا سرکش ہے اور وہ ضلالت ونسیان کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے اور شیاطین اسے ادھر اُدھر بھکارہے ہیں حتیٰ کہ وہ ناکام ہی ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور آخر کار وہ خسران وزیاں اٹھا کر دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

طریق تصوف کی ضرورت بعض حضرات کا خیال ہے کہ صرف شریعت کے اوامر و مناہی کا پابند ہونا نفس کے تزکیہ و تصفیہ کے واسطے کافی ہے اور کسی شیخِ کامل کی بیعت میں آنا ضروری نہیں۔ اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ قرآن و سنت کی پابندی سے انسان اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک ترقی کرسکتا ہے۔ اور جس نے جو کچھ بھی پایا ہے اسی کی پابندی سے پایا ہے مگر گفتگو اس میں ہے کہ مقامات عالیہ مثلاً اخلاص، زہد، اتقا، ورع، توکل، صبر، رضا اور تسلیم وغیرہ کی حقیقت نہ تو فقط حدیث و تفسیر کے پڑھ لینے سے حاصل ہوتی ہے اور نہ رسمی طور پر امر و نہی کی پابندی سے دور کیوں جاتے ہو، جن علما شریعت نے کسی شیخِ کامل کے سامنے زانوئے ادب تہ نہیں کیا اور ذکر و مجاہدہ کی منزلیں طے نہیں کیں ان کو مذکورہ بالا مقامات میں امتحان کرکے دیکھ لو کہ آیات و احادیث میں تو بال کی کھال اتار کر دکھا دیں گے، مگر روحانیت سے انھیں کچھ بھی علاقہ نہیں ہوگا۔ غرور، نخوت، عجب، حرص، شہوت اور طلب جاہ وغیرہ امراض مہلکہ میں اسی طرح مبتلا ہوں گے جس طرح دوسرے اہل دنیا مبتلا ہوتے ہیں، اس سے یہ بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ ہر ایک شخص جو برائے نام کسی شیخِ وقت سے بیعت کرلے تو وہ مقاماتِ عالیہ کو یوں ہی طے کر لیتا ہے نہ ہزاروں بیعت کنندگان کو دیکھا گیا ہے کہ مقامات تو در کنار، وہ بے چارے ظاہری شریعت کی پابندی سے بھی گئے گذرے ہوتے ہیں بلکہ حق یہ ہے کہ شیخِ کامل سے صرف وہی شخص فیض حاصل کرسکتا ہے جو تمام آداب سلوک کا عملی طور پر پابند ہو اور مجاہدہ و ریاضت میں اپنی عمر کا ایک حصہ صرف کرے ورنہ ظاہری احکام شریعت کی پابندی جس کا اثر باطن پر کچھ نہ ہو محض رسم و عادت ہے جس کی اہل حقیقت کے نزدیک کچھ بھی قدر و منزلت نہیں۔

شیخ عزالدین محدث جو کبار علما میں سے ہیں وہ مشائخ کی صحبت حاصل کرنے کے قبل نہایت تعصب اور اصرار کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ یہ گروہ صوفیا کیسا بدعات پھیلانے

والا گروہ ہے، بھلا کتاب و سنت کی پیروی کے علاوہ کوئی اور بھی طریق حق ہو سکتا ہے مگر ایک دفعہ مقام دمیاط (علاقہ مصر) میں بڑے بڑے محدثین و فقہا مثل شیخ تقی الدین رح کی مجلس میں آپ کو حاضر ہونے کا اتفاق ہوا، اور امام قشیری رح کے رسالہ تصوف کی بعض عبارات میں گفتگو شروع ہوئی، اسی اثناء میں شیخ ابوالحسن شاذلی رح بھی تشریف لے آئے چونکہ آپ مشائخ وقت میں سے تھے سب نے استدعا کی کہ اس کے متعلق کچھ فرمائیں آپ نے جواب دیا کہ اس قدر علماء و فضلاء کے ہوتے ہوئے میرے کہنے کی کیا ضرورت ہے مگر بار بار اصرار پر آپ نے ان مقامات کی ایسی تشریح فرمائی کہ شیخ عزالدین بلا اختیار پکار اٹھے کہ سنو سنو یہ وہ کلام ہے جو ابھی حق تعالیٰ کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے اور یہ ایسا کلام ہے جس سے حقانیت کے انوار چمکتے نظر آتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح اپنی مشہور کتاب غنیۃ الطالبین میں فرماتے ہیں کہ بغیر تربیتِ شیخ کے کوئی شخص منازلِ سلوک طے نہیں کر سکتا اور آگے چلکر فرماتے ہیں فلا ینبغی لہ ان ینقطع عن الشیخ حتی یستغنی عنہ بالوصول الی ربہ عز وجل یعنی اس کو شیخ کی خدمت اور صحبت سے اسوقت تک علیحدہ نہیں ہونا چاہیئے جب تک کہ وصول الی اللہ یعنی منزل مقصود تک نہ پہونچ جائے۔

صاحب جامع الاصول نے بھی اس سلسلہ میں ایک بحث کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے وہ فرماتے ہیں کہ قدیم زمانے سے یہ رسم چلی آتی ہے اور تجربہ بھی اس پر شاہد ہے کہ اندرونی نجاستوں اور غلاظتوں سے پاک و صاف ہونا اور نماز کو حضورِ قلب اور خشوع سے ادا کرنا جس کو حدیثِ نبوی میں ان تعبد اللہ کانک تراہ میں لفظ احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شیخ کامل کی تربیت کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ شیخ ہی اندرونی امراض کا واقف اور ان کے علاج کی مہارت رکھتا ہے یہ بات فقط علم حاصل کر لینے اور تودہ در تودہ کتابوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ

نفس کی باریک رہزنیوں اور خفی آثار سے فقہ وحدیث کے بڑے بڑے علما بھی محفوظ نہیں ہیں،
انسان کا اپنا تجربہ اس میں کافی دلیل ہے بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ۔

امام شعرانی نے اپنی مشہور کتاب انوارِ قدسیہ میں شیخِ کامل کی پیروی کو واجب
ثابت کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ اندرونی نجاستوں کا دور کرنا واجب ہے پس اس طریق کا حاصل
کرنا بھی واجب ہوگا جس سے وہ دور ہو سکیں اور وہ بجز اتباعِ شیخ کامل کے اور کوئی طریق نہیں،
پھر لکھتے ہیں۔ ولو تکلّف لا ینفع بغیر شیخ ولو حفظ الف کتاب یعنی کوئی شخص خود
بخود اپنی اصلاح کرنے لگے تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہوگا، اگرچہ وہ ہزاروں کتابیں حفظ کرلے،
سو اے عزیز! تجھے لازم ہے کہ تو کسی شیخِ کامل کی تلاش کر، اور سرکشی نہ کر، اور امرِ آخرت میں غور
سے کام لے اور اس غلط خیال سے بچتے رہنا کہ صوفیا کا طریق کتاب وسنت کے خلاف ہے
کیونکہ یہ کفر ہے اس طائفہ عالیہ کا طریق عین اخلاق محمدیہ اور سیرتِ احمدیہ اور سنت الٰہیہ ہے۔
غور کیجئے کہ امام احمد حنبل ؒ اور شیخ عزالدین جیسے بڑے بڑے جلیل القدر محدثین کس طرح انکار
کے بعد آخر میں صوفیائے کرام کے فیضِ باطنی کے اقرار پر مجبور ہوئے امام احمدؒ شروع شروع میں
اپنے عزیز بیٹے کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ بیٹا دیکھنا کہیں ان لوگوں کی صحبت میں نہ بیٹھنا جنھیں
صوفیا کہتے ہیں کیونکہ یہ لوگ شریعت کے احکام سے بے خبر ہوتے ہیں، سو تم سوائے علم حدیث
کے کسی اور کام میں نہ لگنا مگر جب امام احمدؒ حضرت ابوحمزہ بغدادی کی مجلس میں دقائق شریعت
آپ سے حاصل کرنے لگے، تب ان کی آنکھیں کھلیں اور بیٹے کو نصیحت فرمانے کہ بیٹا دیکھنا
کہیں ان لوگوں پر جنھیں صوفیا کہتے ہیں بدظنی نہ کرنا اور کبھی ان کی صحبت سے غافل نہ رہنا کیونکہ
یہ ان اسرار و معارف کے خزانوں پر اطلاع رکھتے ہیں جس سے ہم لوگ بے بہرہ ہیں، یہ لوگ
حقیقی علوم و خشیت اور زہد و اخلاص کے مالک ہیں جنھیں علما و فقہ و حدیث سینکڑوں دفتر دل،

سے بھی حاصل نہیں کر سکتے اسی طرح حضرت شیخ عزالدین سخت انکار کے بعد جب شیخ ابو الحسن شاذلیؒ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقعہ ملا تو کہا کرتے تھے کہ صوفیاء کرام کی صداقت پر یہی کافی دلیل ہے کہ یہ لوگ اہل حقیقت ہیں اور دوسرے صرف رسم و عادت میں پڑے ہیں۔ یہ ان حقائق و معارف اور خرق عادت کے مالک ہوتے ہیں جو دوسروں کو ہزار کتابوں کے پڑھنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

حضرت امام شافعیؒ جیسے مجتہد اور امام فقہ فرماتے ہیں۔ یحتاج الفقیہ الیٰ معرفۃ اصطلاح الصوفیہ لیفیدہ من العلم مالم یکن عندہ۔ یعنی فقیہ کو صوفیائے کرام کی اصطلاحات کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ اس کو ان علوم کا فائدہ پہونچائیں جن کو یہ نہیں جانتا۔ اس موقعہ پر یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر طریقہ صوفیاء ضروری ہوتا تو صحابہ، تابعین اور آئمہ مجتہدین نے جس طرح جملہ احکام شریعہ کی تفصیل و توضیح فرمائی ہے طرق صوفیاء پر بھی ضرور بحث کرتے اور امراض قلبی کے اسباب اور تشخیص و معالجہ کی کیفیت بتلاتے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان بزرگوں کا زمانہ خیر القرون اور ہر قسم کی بے اعتدالیوں سے قطعاً پاک و صاف تھا اس زمانے میں عام مسلمان کتاب و سنت کو جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے اور طریق سنت سے ایک قدم بھی ادھر ادھر نہیں ہوتے تھے مگر بعد میں جب فلسفہ طبیعتوں پر غالب ہونے لگا اور لوگوں کے دلوں میں سے انوار نبوت کی چمک کم ہونے لگی تو علماء ربانی نے بھی اس طرف توجہ کی اور اندرونی امراض کو دور کر کے نفسوں کو پاک و صاف بنانے کے لئے ذکر و شغل میں کتاب و سنت کے موافق اجتہاد کرنا شروع کیا علاوہ ازیں یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ جو حضرات کتاب و سنت میں قرون اولیٰ جیسے ائمہ کا علم و عمل رکھتے ہوں ان کو اگر مشائخ کی ضرورت نہ بھی ہو تو کوئی تعجب خیز امر نہیں، کیونکہ وہ اتباع کامل

کی وجہ سے ظاہر و باطن میں عین شریعت کا نمونہ ہوتے ہیں اور یہی صوفی کے معنی ہیں۔ اسی کو حضرت امام قشیری نے یوں بیان فرمایا ہے: اول ما حدث ظہور الامراض الباطنۃ اواخر المأتہ الثالثۃ لقولہ علیہ السلام خیر القرون قرنی ثم الذین یلونہم ثم الذین یلونہم فمن شہد لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بالخیریۃ فقد حاز رتبۃ الکمال کلہ۔ یعنی امراض باطنی کے ظہور کا زمانہ تیسری صدی ہجری کا آخری دور ہے جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بہترین امت میرے زمانے کے لوگ ہیں پھر جو لوگ ان کے بعد ہوں گے، پھر جو ان کے بعد ہوں گے، پس جن لوگوں کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہتری کی شہادت دی ہو، وہ واقعی تمام کمالات کے جامع ہوں گے اور یہ بات عقلاً بھی درست ہے کیونکہ جس طرح آفتاب کے غروب ہو جانے پر تھوڑی دیر کے لئے روشنی کا اثر قائم رہتا ہے اور آہستہ آہستہ رات کی سیاہی چھا جاتی ہے۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہو جانے پر آپ کے انوار نبوت کا عکس صحابہؓ تابعین اور تبع تابعین کے پاک دلوں پر برابر چمکتا رہا، حتیٰ کہ آہستہ آہستہ بدعات نے زور پکڑا اور عام اندھیرا چھا گیا۔ ایسے نازک وقت میں مشیت الٰہی نے چاہا کہ اولیائے کرام اور اصفیاء عظام کو مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں پیدا کرتا رہے۔ تاکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقیقی تعلیم کا سلسلہ بدستور جاری رہے، پس جو شخص رسمی اسلام کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف آنا چاہتا ہو اور جزوی مسائل میں غیر مناسب بحث کو چھوڑ کر منکرین کی سنی سنائی بدظنی سے محفوظ ہو چکا ہو، وہ ایک دم کیلئے بھی شیخ کامل کی ضرورت سے انکار نہیں کر سکتا۔

غور فرمائیے حافظ ابن حجر عسقلانی شارح صحیح بخاری کس درجہ کے محدث ہیں، وہ نہایت زور سے اس خیال کی تصدیق اور تائید فرماتے ہیں۔ حیث قال، تلمیذہ ثقۃ وحجۃ ولا

يلتفت الیٰ من يتعصبُ وليتحرّ اورع المشائخ واعرفهم بقوانين الشريعة والحقيقة وليترك رسومه وليدخل تحت اشارتة ومن ظفر بشيخ هٰذا الوصف فحرام ان يتركه ويدل لك عليه الادلة الاربع بل يشهد له الکتب السماوية۔ یعنی طالبِ خدا کو چاہئے کہ شیخ کامل کو اپنا رہبر بنائے اور اہل تعصب کی باتوں کو ہرگز نہ سنے اور یہ خیال رکھے کہ اس کا شیخ عارف کامل ہو اور احکام شریعت و طریقت سے پورا واقف ہو اور چاہیئے کہ رسم و عادت کے اسلام کو چھوڑ کر اپنے شیخ کے حکم پر چلے اور جب کسی شخص کو ایسا رہبرِ کامل مل جائے تو اس پر اس کا چھوڑنا حرام ہے اور ہمارے اس دعویٰ پر کتاب و سنت و اجماع امت اور قیاس صحیح چاروں ادلۃ شاہد ہیں بلکہ آسمانی کتابیں بھی اس ہمارے دعوے کی صداقت پر گواہ ہیں اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں کتب تصوف میں درج ہیں لیکن طالبِ حق کے لئے اسی قدر کافی ہے ـــــ اور اگر تعصب والے اس سے متاثر نہ ہوں تو اس کا کوئی علاج نہیں۔

بقبولے کسے را دست رس نیست قبول بتلاں در دست کس نیست

تصوف اور سلوک کا مقصد

سلوک کا مقصد صرف رضائے حق ہے۔ اس کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ اول طریق کا علم دوم اس پر عمل کرنا طریق ایک ہی ہے یعنے احکام ظاہرہ و باطنہ کی پابندی اور اس طریق کی مددگار دو چیزیں ہیں ایک ذکر اللہ جس پر دوام ہو اور دوسری صحبت اہل اللہ جس کثرت سے بھی میسر ہو سکے، اگر کثرت صحبت کی فرصت نہ ہو تو بزرگوں کے مقالات و حالات کا مطالعہ کسی درجہ میں اس کا بدل ہو سکتا ہے معصیات و فضولیات میں انہماک و مشغولیت اس طریق یا حصول مقصود کی راہ میں مانع ہیں۔

سلوک کا مدار سلوک اس بات پر موقوف ہے کہ نفس کو شہوات سے روکا جائے معصیات سے تو بالکلیہ اجتناب ضروری ہے اور مباحات کی تقلیل لابدی ہے تاکہ حرکت الی الآخرہ نصیب ہو۔ حرکت الی الآخرہ تین طرح کی ہوتی ہے۔

اول حرکت اعتقادی یعنی اعتقادات درست ہوں، دوسرے حرکت عملی یعنی اعمال آخرت کا اہتمام، تیسرے حرکت حالی یعنی آخرت کی دھن میں ہر وقت مضطرب اور بے چین ہو، اور رات دن اسی کی کاوش ہو۔

طلب اور دھن پیدا کرنے کا طریقہ اس کے لئے کثرت سے مراقبات کئے جائیں۔ دنیا کے فنا و اضمحلال کا، ثواب وعقاب کا، حق تعالےٰ کے انعامات و احسانات کا اپنی موت وبلا کا، آخرت کے بقا وثبات کا نیز اہل اللہ کی محبت و صحبت اختیار کی جائے اور ذکر وشغل کیا جائے۔

توحید کا عقیدہ عقیدۂ توحید فی نفسہٖ مقصود ہے اور یہی عقیدہ اعمال صالحہ کا وسیلہ بھی ہے کلمۂ طیبہ کی جڑ دراصل عقیدہ توحید ہی ہے اس عقیدہ کو پختہ کرنے کا طریقہ یوں کثرتِ ذکر ہے کہ چلتے پھرتے لاالٰہ الا اللہ یااللہ یااللہ کا ورد رکھے، زبان سے سانس سے اور قلب سے۔

وصول الی اللہ کا طریقہ حق تعالیٰ تک پہونچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اخلاقِ رذیلہ جاتے رہیں، اور اخلاق حمیدہ پیدا ہو جائیں، معاصی چھوٹ جائیں، طاعت کی توفیق ہو، غفلت من اللہ جاتی رہے اور توجہ الی اللہ پیدا ہو جائے۔

محبت پیدا کرنے کا طریقہ اہل محبت کے پاس بیٹھے۔
آہن کہ بپارس آشنا شد۔ فی الحال بصورتِ طلا شد

اللہ والوں کی محبت درحقیقت اللہ تعالیٰ سے محبت ہے۔

بیعت کی حقیقت اصل بیعت یوں انقیاد اور اعتقاد کا نام ہے کہ ایک شخص راہ بتانے والا ہو اور دوسرا اس کی تابعداری کرنے والا، ہاتھ میں ہاتھ دینا محض طالب کی تسلی کے لئے ہوتا ہے تاکہ اس کو اطمینان ہو جائے کہ فلاں بزرگ کے ساتھ ایک خصوصیت ہو گئی۔

مقصدِ طریقت طریقت کا اصل مقصود اپنے نفس کی اصلاح اور اعمال کی خبرگیری ہے۔

شیخ کامل کی شناخت شیخ کامل کی پہچان یہ ہے کہ وہ شریعت کا پورا پورا متبع ہو، بدعت و شرک سے محفوظ ہو، جہل کی بات نہ کرتا ہو، اس کی صحبت میں بیٹھنے کا اثر یہ ہو کہ دنیا کی محبت گھٹے اور حق تعالیٰ کی محبت بڑھے، توجہ الی اللہ حاصل ہو، اور جو بھی اپنا باطنی مرض اس کے سامنے بیان کیا جائے وہ اسے پوری توجہ سے سنے اور اس کے علاج کی طرف متوجہ ہو۔

توجہ کے طریقے توجہ کے دو طریقے ہیں۔ اول مرید کی اصلاح کی خاطر اس میں ذوق و شوق اور محبت حق و خوف و خشیہ وغیرہ اخلاق باطنہ کے حصول کیلئے حق تعالیٰ سے دعا کی جائے اور وعظ و نصیحت اور تلقین کے ذریعہ مرید کی طرف توجہ رکھی جائے یہ طریقہ توجہ مستحسن اور سنت نبوی کے عین مطابق ہے۔

دوسرا طریقہ جو عام طور پر متصوفین میں رائج ہے وہ یہ ہے کہ شیخ اپنے قلب کو تمام خطرات و خیالات سے خالی کر کے خاص طور پر مرید کی طرف توجہ کرتا ہے اس میں تصور بقصد تصوف ہوتا ہے اور توجہ کے اس طریق میں درحقیقت فاعل اور مؤثر قوت متخیلہ ہوتی ہے جو ہر انسان میں قدرتاً ودیعت رکھی گئی ہے، یہ قوت متخیلہ زمین میں بھی بہت زیادہ پائی جاتی ہے، بغیر تار

کے جو خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچائی جاتی ہیں ان کا ذریعہ بھی یہی قوت برقیہ ہے نظر لگنے سے جو اثر ہوتا ہے وہ بھی دراصل یہی قوت برقیہ ہے۔ درحقیقت مسمریزم اور اس توجہ متعارف کا منشا اور ماخذ ایک ہی ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ ایک بری جگہ استعمال کی جاتی ہے اور دوسری اچھی جگہ کام آتی ہے، یہ طریقہ مشق پر موقوف ہے مشق اس لئے کی جاتی ہے تاکہ دوسرے پر نسبت کا القا کیا جا سکے۔ بعض مشائخ اس طریق توجہ سے بہت زیادہ کام لیتے ہیں لیکن یاد رہے کہ اس کا نفع دیر تک باقی نہیں رہتا اور طالب فوری کیفیت کو کافی سمجھ کر اس پر اکتفا کر کے کام چھوڑ دیتا ہے۔

ہمارے نزدیک متصوفین کے اس طریقہ توجہ میں بچند وجوہ خلجان ہے۔ اول یہ کہ تو یہ طریقہ سنت نبوی کے خلاف ہے۔ دوسرے اس طریق توجہ سے عمل میں سستی پیدا ہوتی ہے۔ اور مرید کی توجہ مجاہدات و ریاضات اور اعمال کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔ تیسرے اس توجہ کے وقت شیخ کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف نہیں رہتی ہے، اگر کہا جائے کہ یوں بھی بسا اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہیں رہتی تو جواب یہ ہے کہ یہاں پر بالقصد ایسا کیا جاتا ہے جو قطعاً ممنوع ہے اور دوسرے اوقات میں بلاقصد ایسا ہو جاتا ہے اور اس میں بندہ معذور ہے۔

خلوت کا مقصد گوشہ نشینی اور خلوت صرف اس لئے اختیار کی جائے کہ دل پورے طور پر حق کی طرف لگ جائے، اگر خلوت میں خطرات آنے لگیں تو پھر مجمع میں بیٹھنا چاہیئے تاکہ قلب پورے طور پر اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ بس اسی مقصد کی وجہ سے یہ جلوت خلوت کے حکم میں ہے۔ ؎

چو ہر ساعت از تو بجائے رود دل | بہ تنہائی اندر صفائی نہ بینی
گرت مال و زر ہست و زرع و تجارت | چو دل با خدا ایست خلوت نشینی

دنیا کی حقیقت لذتِ نفسانی اور حظِ شہوانی میں اس قدر مشغول ہونا کہ آخرت کا ضرر حاصل ہو اور لذات و حظوظ نفسانی ذکرِ الٰہی اور فکرِ آخرت سے غافل کر دیں در حقیقت اس کا نام "دنیا" ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

معرفت کی حقیقت معرفت نام ہے دنیا کی قدر کا دل میں نہ ہونا، طالبِ صادق دنیا سے قلب کو بالکل خالی اور علیحدہ رکھے، بلا ضرورت دنیا کا سامان جمع نہ کرے۔

چیست تقویٰ ترک شبہات و حرام
از لباس واز شراب واز طعام
ہر چہ افزوں است اگر باشد حلال
نزدِ اصحاب ورع باشد وبال

درجۂ فنا کی تعریف محبت کے اعلیٰ درجہ کو درجۂ فنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی جملہ تعلقات غیر اللہ اس قدر مغلوب ہو جائیں کہ نہ کوئی خدا کے معبود ہونے میں شریک رہے جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا مآل ہے اور نہ اس کے مقصود ہونے میں حائل ہو جو فلیعمل عملاً صالحاً ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً کا حاصل ہے اور نہ ہی سالک کی نظر میں اس کے موجود ہونے میں شریک رہے جو کل شئ ھالک الا وجہہ کا حاصل ہے۔

مشاہدہ کے اقسام مشاہدہ کی دو قسمیں ہیں اول مشاہدۂ تام یعنی حق سبحانہٗ تعالیٰ کی رویت سو یہ تو جنت میں حاصل ہوگی۔ دنیا میں یہ رویت غیر ممکن ہے۔

دوسرے مشاہدۂ ناقص یا استحضار تام، یہ اس دنیا میں ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت بندہ کو گاہ بہ گاہ ہوتی ہے۔ ہمیشہ نہیں رہتی اور نہ رہ سکتی ہے۔

عروج روحانی کی تحصیل کی صورت روحانی عروج حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ

مقتضیاتِ شریعت پر عمل کیا جائے اور ظاہر جسم سے کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جو خلاف شرع ہو حق تعالیٰ کا محبوب اور محب بننے کے لئے ضروری ہے کہ ہمت کرکے اعمال میں ظاہراً و باطناً پورے طور پر شریعت کی پابندی کی جائے، اللہ اللہ کرنا اور کبھی کبھی اہل اللہ کی صحبت میں جانا اور مواقع حرام سے اجتناب کلی کرنا بھی ضروری ہے۔

جمالِ الٰہی کا مظہر محل حرام نہیں ہوتا

بعض جاہل اور ملحد کہتے ہیں کہ خدا کے جمال و کمال کی تمام چیزیں مظہر ہیں اس لئے کسی چیز کو دیکھنا حرام نہیں لہٰذا امرد لڑکوں اور غیر محرم عورتوں پر نظر ڈالنے میں کوئی قباحت اور برائی نہیں ہے یہ محض دھوکہ اور نفس کا فریب ہے جب شریعت نے اسے حرام قرار دیا ہے تو یہ ہوائے نفسانی اور شہوانی خواہشات کے سوا اور کچھ نہیں۔ جمالِ الٰہی کا مظہر محرمات شرعیہ ہرگز نہیں ہوسکتے بلکہ یہ صرف اُن مواقع میں ہوگا جو حلال اور جائز ہیں۔

ذکر و شغل کا مقصد

ذکر و شغل کا اصل مقصد اپنے ظاہر و باطن کی اصلاح ہے، بغیر اس کے ذکر و شغل بیکار ہے، ذکر میں اسم ذات اللہ کی کثرت، دوسرے اذکار و اشغال سے زیادہ مفید اور بہتر ہے، البتہ اس سلسلہ میں اہل اللہ کی صحبت بہت زیادہ ضروری ہے۔

گِلے خوشبوئے در حمام روزے	رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکے یا عبیری	کہ از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتہ من گلِ ناچیز بودم	ولیکن مدتے با گُل نشستم
جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد	دگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ذکر و شغل کا نفع ذکر و شغل میں استحضار مذکور کی مداومت ہونی چاہیئے۔ ابتدا میں

الجھن ضرور ہوگی اور نفع بھی محسوس نہ ہوگا لیکن اگر اسے چھوڑ نہ دیا جائے پھر ایسی عادت پڑ جائے گی کہ اس کے بغیر چین نہیں آئے گا۔ اور ملکۂ تامہ حاصل ہو جائے گا۔ کسی ایک یا دو ذکر پر مداومت ہونی چاہئیے۔ مختلف اذکار سے انتشار پیدا ہوتا ہے اور کسی ایک ذکر کی بھی کیفیت پیدا نہیں ہونے پاتی۔ نیز ذکر میں ثمرات کے ترتب کا بھی خیال نہ کرے بلکہ ذکر کی کثرت مداومت کے ساتھ کئے جائیے۔

توکل ورضا کی حقیقت توکل یہ ہے کہ تدبیر مباح کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے اور تدبیر میں زیادہ انہماک نہ ہو، توکل بعض کے لئے مطلق تدبیر ظنی کا ترک ہے اور بعض کے لئے یہ ہے کہ تدبیر غیر مباح اور تدبیر مباح میں انہماک کو ترک کر دے۔ تفویض یہ ہے کہ اس کے بعد اگر تدبیر میں ناکامی ہو یا وہ واقعہ تدبیر سے تعلق ہی نہ رکھتا ہو، جیسے غیر اختیاری مصائب تو حق تعالیٰ پر اعتراض نہ کرے۔ پس تقویٰ کی حقیقت توکل کا اعلیٰ درجہ ہے۔ اور اس درجہ علیا کا اثر رضائے الہٰی ہے۔

قلندر وطریقۂ قلندری ایسی شان رکھنے والے کو قلندر کہتے ہیں جو حق تعالیٰ سے کامل محبت رکھتا ہو اور خدمت وطاعت میں پوری مشقت اٹھاتا ہو اور کسی کی ملامت سے نہ ڈرتا ہو۔ طریق قلندر کے دو جز ہیں ایک عمل (جو طریق پارسائی کی حقیقت ہے) اور دوسرا محبت، دراصل طریقۂ قلندری عمل ومحبت دونوں کے مجموعہ کا نام ہے متقدمین کی اصطلاح میں طریق قلندری یہ ہے کہ اعمال ظاہرہ مستحبہ کی تو تقلیل ہو لیکن محبت کی خاص رعایت ہو یعنی تفکر ومراقبہ زیادہ ہو، اور متاخرین کی اصطلاح میں طریقۂ قلندری یہ ہے کہ خاص اعمال ظاہرہ مستحبہ کی تکثیر کے ساتھ غلبۂ آزادی ہو لیکن یہ آزادی خلق سے ہو، نہ کہ خالق سے یعنی قلندر کو دنیا کی وضع اور رسوم اور دنیوی مصلحتوں کی مطلق پرواہ نہیں ہونی چاہئیے۔

مدارات و مداہنت

مدارات حضرات صوفیاء کرام کی ایک مخصوص شان اور صفت ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جاہلوں کے ساتھ نرمی برتی جائے تاکہ ان کے شر و فساد سے نجات رہے اور یہ دونوں امر شرعاً مطلوب ہیں۔ اول تو یہ خود دین میں مطلوب ہیں اور دوسرے مقصود میں معین و مددگار ہیں کیونکہ بسا اوقات شر و فساد میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے طاعت میں کمی اور تبلیغ و اصلاح میں خلل پڑ جاتا ہے اور مداہنت بد دینوں کے ساتھ نرمی کرنے کا نام ہے تاکہ ان اموال و جاہ کا نفع حاصل ہو۔

آثارِ خشوع

خشوع اور تواضع کے آثار یہ ہیں کہ انسان گردن جھکا کر چلے، بات چیت اور معاملات میں سختی نہ کرے، غصہ اور غضب میں آپے سے باہر نہ ہو اور نہ ہی انتقام لینے کی فکر میں رہے۔

ایمان اور عمل صالح سے غذائے روحانی کا حصول

جس طرح پیٹ کی غذا ماکولات و مشروبات، آنکھ کی غذا مبصرات اور کان کی مسموعات الگ الگ ہے۔ اسی طرح دل کی بھی ایک غذا محبت ہے۔ در حقیقت دل کی غذا سوائے محبت کے اور کچھ نہیں اس کو صرف محبت ہی میں مزہ اور لذت ملتی ہے پس محبوب کے نقص و کمال کی وجہ سے محب کی لذت بھی ناقص کامل ہوگی۔ ایمان اور عمل صالح سے دنیا میں ہی روح کو غذائے روحانی مل جاتی ہے یعنے حق تعالیٰ کی محبت کامل حاصل ہو جاتی ہے جس سے بڑھ کر دل کے لئے اور کوئی غذا نہیں۔ ان الذین آمنو وعملوا الصّٰلحات سیجعل لہ الرحمٰن ودا" کا مطلب یہی ہے کہ ایمان اور عمل صالح سے قبولیت و محبوبیت تامہ پیدا ہو جاتی ہے حتیٰ کہ غیر معاند کفار کے قلوب میں بھی ایسے بندگانِ خدا کی عظمت ہوتی ہے بلکہ وحشی جانور بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ

غلام حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ قافلہ سے علیحدہ ہوکر راستہ بھول گئے۔ رات کو راستہ میں ایک شیر ملا حضرت سفینہؓ نے کہا کہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں یہ سنکر شیر اپنی دم ہلانے لگا اور خوشامد میں کرتا ہوا ان کے آگے آگے چل پڑا اور تھوڑی دیر میں آپ کو قافلہ میں پہونچا کر واپس چلا گیا۔ یہ تو محبتِ خلق کا ظہور ہوا اور محبتِ حق کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ آواز تو نہیں سنائی دیتی مگر محبتِ حق کا اثر دل میں موجود ہوتا ہے۔ ہر وقت تمام معاملات میں اللہ کی طرف سے امداد و اعانت ہوتی ہے اور قلب پر علوم و واردات اور کلام حق کا یوں القا ہوتا ہے جیسے حق تعالیٰ اس سے باتیں کرتے ہیں۔ بس آواز نہیں ہوتی اور سب کچھ ہوتا ہے ایسے شخص کا دل کہتا ہے کہ حق تعالیٰ مجھ کو پسند کرتے ہیں، پھر اس کی لذت کا کیا ٹھکانا ؟ باقی رہا اس کا کامل ظہور تو دارِ آخرت میں ہوگا، یقیناً غذائے روحانی، غذائے جسمانی سے افضل اور الذّ ہے کیونکہ جملہ نعمتوں سے اصل مقصود راحتِ قلب ہے جو غذائے جسمانی سے بالواسطہ، اور غذائے روحانی سے بلاواسطہ حاصل ہوتی ہے۔ پھر کمال یہ ہے کہ اس دسترخوان پر مختلف غذائیں ہیں کبھی تم محب ہو اور حق تعالیٰ محبوب اور کبھی حق تعالیٰ محب ہیں اور تم محبوب اس کی لذت کچھ اور ہی ہے، اس کے نتیجہ میں خلق کو تم سے محبت ہوجاتی ہے جس کی لذت دوسری ہے نیز خلق سے تمھیں محبت ہوجاتی ہے پس ہم کو ایمان اور اعمالِ صالحہ کی تحصیل اور تکمیل میں سعیٔ بلیغ کرنی چاہیئے تاکہ قلب کی راحت و لذت کی دولتِ بے بہا حاصل ہو۔

معصیت کا علاج معصیت کے صدور سے پہلے ہمت کی ضرورت پڑتی ہے اور صدورِ معصیت کے بعد توبہ لازم ہے، اس کے علاوہ اور کوئی علاج نہیں ؎

عمر عزیز لائق سوز و گداز نیست
ایں رشتہ را مسوز کہ چنداں دراز نیست

تعلق من العبد و مع الحق

اپنے متعلقین کے حقوق کو دیندار شخص سے زیادہ اور بہتر کوئی بھی ادا نہیں کر سکتا کیونکہ جب بندہ کا تعلق حق تعالیٰ سے مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر دنیا کے تعلقات کے حقوق پہلے سے بھی زیادہ مستحکم اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ پہلے ان حقوق کو محض اپنے حظ نفس اور خواہش کے لئے ادا کیا جاتا تھا اور اب رضاء محبوب کیلئے ان کی ادائیگی ہوتی ہے جو لوگ دیندار ہو کر اپنے متعلقین کے حقوق میں کمی اور کوتاہی کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت دین سے ناواقف اور جاہل ہیں وہ ہرگز پورے طور سے دیندار نہیں، اگرچہ انکو دنیا دیندار سمجھتی ہو۔

باب اول

ولایت کا اثبات

ولایت دو طرح کی ہے، ایک ولایت عام اور دوسری ولایت خاص۔ ولایت عام میں تمام مومنین شامل ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری عزاسمہٗ ہے:

اللّٰہُ ولی الذین آمنوا — اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا دوست ہے

ولایت خاص یہ ہے کہ بلا کسی امید و بیم کے خدا کی یاد دل میں ایسی مستحکم ہو اور ذات پاک سے دل کا تعلق اس قدر مضبوط ہو کہ راحت ہو یا تکلیف کسی حال میں اس سے غفلت نہ ہو، اسی کو اصطلاحِ صوفیا میں نسبت اور مشاہدہ کہتے ہیں اور یہ مرتبہ فنا و بقا کے بعد حاصل ہوتا ہے، ارشاد خداوندی ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا آمنوا باللّٰہ و رسولہ — اے مومنو اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ۔

اس آیت کریمہ میں ایمان والوں سے ایمان لانے کو ارشاد فرمایا گیا ہے۔ پس ایمان ثانی کی تکمیل کے واسطے طریقت ہے اور ایمانِ اول کے لئے شریعت ہے اور اسی ایمان ثانی کے کمال کو ولایت کہتے ہیں۔ اس طرح اس آیۃ کریمہ سے ولایت خاص کا ثبوت ہوتا ہے۔ افسوس کہ اس زمانے میں نور باطن سے محروم علماء ظاہر ولایت خاص اور علم باطن کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ علم ظاہر کے علاوہ اور کوئی علم باطن نہیں ہے۔

علم باطن سے انکار محض ناواقفیت پر مبنی ہے، ورنہ قرآن پاک اور احادیثِ صحیحہ سے

اس کا ثبوت ملتا ہے اگر منکرین قرآن پاک کے معنی و تفسیر کو بنظرِ غائر دیکھیں اور احادیث، اقوال صحابہ اور ائمہ اسلام کے ارشادات میں غور و فکر کریں تو وہ ہرگز علم باطن کا انکار نہیں کر سکتے۔ ولایتِ خاص اور علم باطن کے ثبوت میں قرآن پاک، احادیث، اجماع امت، قیاس اور دلائل عقلیہ و نقلیہ بکثرت موجود ہیں۔ ہم یہاں پر نہایت اختصار کے ساتھ چند دلائل پیش کرتے ہیں۔

دلیل اوّل: حق تبارک و تعالیٰ نے حضرتِ موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا ذکر سورۂ کہف میں فرمایا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے لئے دریا کے کنارے تشریف لے گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے فرمایا ہے۔

ھل اتبعك علی ان تعلمن مما علمت رشدا (کیا میں تمھاری پیروی کروں اس خیال سے کہ تم مجھے سکھلاؤ گے وہ امور ہدایت جو تمھیں سکھلائے گئے ہیں) اس کے جواب میں حضرت خضرؑ نے کہا انك لن تستطیع معی صبرا وکیف تصبر علی ما لم تحط به خبرا (بے شک آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکتے اور آپ ان باتوں پر کیونکر صبر کر سکتے ہیں جو آپ کے تجربہ اور علم سے باہر ہوں)۔

پھر حضرت موسیٰؑ حضرت خضرؑ کے ہمراہ چلے اور جب بحکم خدا حضرتِ خضر نے مزدوروں کی کشتی توڑی اور یتیم کی دیوار بنائی اور ایک بچہ کو مار ڈالا تو موسیٰ علیہ السلام نے حضرتِ خضرؑ کی ہر ایک بات پر اعتراض کیا اور ان کا یہ اعتراض بموجب شریعت موسوی بالکل درست تھا۔

بالآخر ان اعتراضات پر حضرتِ خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے احکام الٰہی کی تعمیل کی مفصل کیفیت بیان کر کے کہا ھذا فراق بینی وبینك (بس اب آپ کا اور میرا ساتھ چھوٹ گیا)۔

اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ ایک اور علم بھی ہے جس کو علم لدنی اور علم باطن کہتے ہیں اس کی خبر بھی حق تعالیٰ نے اسی سورۃ میں دی ہے۔ فوجدا عبدا من عبادنا آتیناہ رحمۃ من عندنا وعلمناہ من لدنا علما (پس موسیٰ اور ان کے ساتھی دونوں نے ہمارے بندوں

میں سے ایک بندہ کو پایا جس پر ہماری رحمت نازل ہوئی تھی اور ہم نے اس کو اپنے پاس سے خاص علم سکھلایا تھا)

اگر شریعت موسوی کے سوا اور کوئی دوسرا علم نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ کو حضرت خضر کی پیروی کی کیا ضرورت تھی جبکہ از روئے عقیدہ حضرتِ موسیٰ حضرت خضر سے اعلیٰ اور برتر ہیں اور تورات کے احکام شریعت جو سراسر نور تھے اور جن کی تابعداری سب پر ضروری تھی، ان کے پاس موجود تھے، اس سے صاف طور سے معلوم ہوگیا کہ علم شریعت کے علاوہ ایک دوسرا علم لدنی بھی ہے جو حضرت خضر کو حاصل تھا اور اس کے لئے حضرت موسیٰ نے ان کی تابعداری اختیار کی تھی۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے افضل اور اعلیٰ ہیں اور ادنیٰ تابعداری کرتا ہے، اعلیٰ کی نہ کہ اعلیٰ ادنیٰ کی اور اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ پیغمبر، حضرت خضر ولی اللہ سے مفضول ہوئے اور یہ بات عقیدۂ حقہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے دو جواب ہیں۔

اول یہ کہ بزرگی اور برتری قرب حق پر منحصر ہے نہ علم پر اور قربِ حق میں حضرت موسیٰ حضرت خضر سے کہیں زیادہ یوں افضل ہیں کہ انھوں نے کلیم اللہ کا خطاب پایا اور یہ شرف حضرت خضر کو کہاں نصیب؟

دوسرے یہ کہ ذات وصفات خالق کا علم اور ہے اور مخلوق کا علم اور ہے اور جس قدر فرق خالق اور مخلوق میں ہے۔ اسی قدر علم خالق اور علم مخلوق میں بھی ہے۔ لہٰذا علم ذات وصفات الٰہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قدم حضرت خضر علیہ السلام سے بہت آگے ہے، اس لئے حضرتِ خضر کے مقابلے میں حضرت موسیٰ کی فضیلت اور برتری ثابت ہوگی۔ قرآنِ عزیز میں

اور بھی بہت سے مقامات پر علم باطن کا ثبوت ملتا ہے مگر ہم اس ایک واقعہ پر اکتفاء کرتے ہیں جن احادیث میں علم باطن کا ثبوت ہے اگر ان سب کو اس میں درج کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے اس لئے ہم صرف حدیث جبرئیل پر اکتفا کرتے ہیں۔

دلیل دوم حدیث جبرئیل سے (جو بخاری اور مسلم میں ہے) صاف معلوم ہوتا ہے کہ عقائد و اعمال کے علاوہ دین میں کوئی اور بھی کمال ہے جس کو لفظ "احسان" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ولایت کہتے ہیں۔

چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی اپنی مشہور کتاب ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں۔

فصل در اثبات ولایت' بداں اسعدک اللہ تعالیٰ چنانکہ در انسان کمالات ظاہری ہستند و آں اعتقادات صحیحہ موافق قرآن و حدیث و اجماع اہلسنت والجماعت و اعمال صالحہ و اداء فرائض و واجبات و سنن و مستحبات و ترک محرمات و مکروہات و مشتبہات و بدعات اند ہمچناں در انسان دیگر کمالات باطنی می باشند۔

ترجمہ (فصل ثبوت' ولایت میں) اے عزیز خدا تجھے نیک کرے سمجھ لے کہ جس طرح انسان میں ظاہری کمالات ہیں یعنی صحیح اعتقادات جو قرآن و حدیث اور اجماع اہلسنت والجماعت کے موافق ہیں اور نیک اعمال اور فرائض و واجبات اور سنن و مستحبات کی ادائیگی اس کے ساتھ محرمات و مکروہات اور مشتبہات و بدعات کا چھوڑنا، اسی طرح انسان میں کمالات باطنی بھی ہوتے ہیں پھر قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حدیث جبرئیل نقل کر کے ارشاد فرماتے ہیں۔

ازیں حدیث معلوم می شود کہ سوائے عقائد و اعمال کمالے دیگر است مسمّٰی باحسان کہ آں را ولایت نام شد صوفی را چوں محبت الٰہی حاصل می شود کہ در

اصطلاح) فنا قلب گفتہ شود دل او بمشاہدہ محبوب حقیقی مستغرق و مستہلک می باشد و بغیر او متوجہ نمی شود دریں حالت خدا رانمی بیند کہ رویت او در دنیا عادتاً محال است لیکن صوفی رادریں وقت حالتے ست کہ گویا خدا رامی بیند و پیش ازیں حالت صوفی بہ تکلف خود رابریں میدارد رسول کریمؐ ازاں حالت خبر داد کہ بدانی خدا ترامی بیند۔

ترجمہ (اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سوائے عقائد و اعمال کے کوئی اور دوسرا کمال بھی ہے جس کا نام احسان ہے جسے ولایت کہتے ہیں۔ درویش پر جب محبت خدا غالب ہوتی ہے جسے صوفیا کی اصطلاح میں فنائے قلب کہا جاتا ہے تو اس کا دل محبوب حقیقی (یعنی اللہ تعالیٰ) کے دیکھنے میں ہمہ تن مصروف اور فنا رہتا ہے اور سوائے اللہ کے کسی طرف اس کی توجہ نہیں ہوتی اس حالت میں حقیقتاً خدا کو نہیں دیکھتا کیونکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کا دیکھنا محال ہے۔ لیکن صوفی پر ایسی حالت طاری ہوتی ہے کہ گویا واقعی وہ خدا کو دیکھ رہا ہے۔

دلیل سوم اہلسنت والجماعت کا اجماع ہے کہ صحابہ کرام غیر صحابہ سے افضل ہیں سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ افضلیت کس وجہ سے ہے حالانکہ علم و عمل میں صحابہ اور غیر صحابہ شارک ہیں بلکہ بعض اوقات غیر صحابہ علم و عمل میں صحابہ سے بڑھ جاتے ہیں باوجود اسکے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص پہاڑ احد کے برابر سونا چاندی خدا کی راہ میں خرچ کرے تب بھی میرے صحابہ کے آدھے سیر جو کے برابر نہیں ہو سکتا جسے میرے صحابہ نے راہ خدا میں صرف کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کی یہ فضیلت بجز کمال باطنی کے اور کسی سبب سے نہیں ہے اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض صحبت تھا کہ ان کا باطن آپ

کے باطن سے روشن ہوگیا تھا اور اولیائے امت کو یہ دولت ان مشائخ عظام کی صحبت اور توجہ سے حاصل ہوتی ہے جنھوں نے بواسطہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے قلوب کو منور کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ کمال ظاہری کے علاوہ کمال باطنی بھی ہے اور اس کے درجات اور مراتب میں فرق بھی ہے۔ چنانچہ حدیث قدسی ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا جو بندہ مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں اس سے ایک گز قریب ہوتا ہوں اور جو شخص مجھ سے ایک گز قریب ہوتا ہے میں اس کی طرف ایک باع (ساڑھے تین گز) بڑھتا ہوں، نیز اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ ہمیشہ عباداتِ نافلہ کے ذریعہ میرا قرب تلاش کرتا ہے یہاں تک کہ اس کو میں دوست رکھتا ہوں اور جب میں اس کو دوست رکھتا ہوں تو میں اس کی بصارت، سماعت اور طاقت ہوجاتا ہوں۔

دلیل چہارم اہل خیر اور اہل تقویٰ کی اتنی بڑی جماعت نے خبر دی ہے کہ ان کا جھوٹ پر اتفاق کر کے کسی غلط بات پر مجتمع ہوجانا محال ہے۔ اس جماعت نے بتایا ہے کہ ہم کو مشائخ کی صحبت سے باطن میں ایسی حالت پیدا ہوئی جو پہلے حاصل نہ تھی۔ اور اس حالت کی وجہ سے حق تعالیٰ اور اس کے اولیاء کے ساتھ محبت، اعمال صالحہ کی توفیق اور اعتقاداتِ حقہ کی پختگی پیدا ہوگئی، ظاہر ہے کہ یہ حالت اور کیفیت یقیناً کمالات کا ذریعہ ہے۔

دلیل پنجم خرق عادات اگرچہ ضعیف اور کمزور دلیل مگر چونکہ تقوے کی وجہ سے کرامت اور سحر میں فرق ہے اس لئے کرامات اور خوارق عادات بھی باطنی کمالات پر دلالت کرتے ہیں اور ان سے بھی ولایت کا ثبوت ہوتا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ علیہ اپنی کتاب مالا بد منہ کے آخر میں کتاب الاحسان

میں فرماتے ہیں۔ یہ جو کچھ کہ کتاب مالابدمنہ میں کہا گیا ہے یہ صورت ایمان، صورتِ اسلام اور صورتِ شریعت ہے۔ اس کا مغز اور اس کی حقیقت درویشوں کی خدمت میں تلاش کرنی چاہیئے اور یہ خیال ہرگز نہ کرنا چاہیئے کہ حقیقت خلاف شریعت ہے کیونکہ یہ خیال جہالت پر مبنی ہے اور کفر کو مستلزم ہے۔ بلکہ درحقیقت شریعت یہی ہے کہ درویشوں کی خدمت میں رہ کر تعلق غیر اللہ سے پاک ہو، نفس کی برائی دور ہونے سے نفس مطمئنہ پیدا ہو اور خلوص حاصل ہو، اس درجہ کے بعد ہی شریعت اس کے حق میں پر مغز حقیقت ہو جاتی ہے، اسکی نماز اللہ تعالیٰ سے یوں خاص تعلق پیدا کرتی ہے کہ اس کی دو رکعتیں اوروں کی لاکھوں رکعات سے بہتر ہوتی ہیں، اسی طرح اس کا روزہ وصدقہ وغیرہ اور دوسری طاعات کا حال ہوتا ہے۔

غور کیجئے کہ اگر صرف علم شریعت ہی ہوتا اور علم باطن نہ ہوتا تو بہت سے علماء ان صحابہ سے بہتر ہوتے جو عالم نہ تھے اور بہت سے مجاہدین ان صحابہ سے بہتر ہوتے جن کو جہاد کا موقعہ نہیں ملا۔ عقل کا بظاہر تقاضا ہے کہ ان پڑھ صحابہ سے عالم دین بہتر ہو اور غیر مجاہد صحابہ سے مجاہد بہتر ہو اور جن صحابہ کی عمر نے وفا نہ کی اور ان کو کثرت عبادات اور صدقات وخیرات کا موقعہ نہ ملا ان سے وہ امتی بہتر اور افضل ہو جو ان کے بعد ان اعمال خیر کا عامل ہوا لیکن امت کا اتفاق ہے کہ صحابہ کی شان تو کہیں بالاتر ہے۔ ان کے دیکھنے والے تابعین اور تابعین کے دیکھنے والے تبع تابعین، اگرچہ دنیاوی لحاظ سے حسب ونسب میں کم ہوں، بعد میں کوئی امام شریعت یا امام طریقت چاہے دنیا کے لحاظ سے حسب ونسب میں کتنا ہی اعلیٰ اور بہتر ہو، ادنیٰ تابعین کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، یہ کیا ہے؟ یہ سب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مبارک۔ اور قرب نبوت کا نتیجہ ہے کہ جو خلوص ونورانیت اور حقانیت صحابہ کے دلوں میں آفتاب نبوت نے ڈالی اور ان کو روشن کیا وہ بعد میں

کسی کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے علم ظاہر میں مکمل ہونے کے باوجود علم باطن حضرت شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ سے اخذ کیا چنانچہ فرماتے ہیں:

ہیچ چیزے خود بخود پیدا نہ شد	ہیچ آہن خود بخود تیغا نہ شد
کوئی چیز اپنے آپ پیدا نہیں ہوتی	اور نہ کوئی لوہا آپ تلوار ہوا
مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم	تا غلام شمس تبریزی نہ شد
مولوی اسوقت تک مولائے روم نہوا	جب تک شمس تبریز کا غلام نہ بنا
گر نہ علم حال فوقِ قال بودے کہ شدے	بندۂ اعیان بخارا خواجۂ نساج را
اگر علم حال علم قال پر فوقیت نہ رکھتا تو یہ کب ہوتا	کہ بخارا کے سردار خواجہ نساج کے غلام بنتے

اصحاب کبار رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین آفتاب نبوت کے پروردہ ہیں اور اولیاء اللہ امت کے چراغ ہیں، پس جس قدر آفتاب اور چراغ میں فرق ہے۔ اسی قدر صحبت نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم اور صحبت اولیا میں فرق ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ کو رسول خدا سے دو علم پہنچے ہیں ایک تو وہ علم جسے میں نے تم لوگوں تک پہونچایا اور دوسرا علم وہ ہے کہ اگر اس کو ظاہر کردوں تو خلق میرا حلق کاٹ ڈالے۔ اس قول سے بھی علم ظاہر اور علم باطن الگ الگ معلوم ہوتے ہیں۔ اگر آپ ذرا دقتِ نظر سے کام لیں تو ہر چیز میں دو چیز نظر آئیں گے ایک ظاہر اور ایک باطن، ظاہر کا علاج شریعت ہے اور باطن کا علاج طریقت، اور علاج ظاہر کی طرح علاج باطن بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اگر کسی مریض کو فسادِ خون ہو اور جسم پر پھوڑے پھنسی وغیرہ نمودار ہوں تو زخم کے واسطے مرہم پٹی کی جائے گی۔ یہ طریقہ علاج اگرچہ فائدہ سے خالی نہیں مگر ناکافی ہے اور فسادِ خون کے واسطے مسہل اور مصفیات کا استعمال ضروری ہوگا، تاکہ

اندرونی مادۂ فاسد دفع ہوجائے جس سے پھر کبھی جسم پر پھوڑا پھنسی ظاہر نہ ہو بعینہٖ اسی طرح باطن کی خرابیوں کا علاج علم باطن ہے تاکہ ظاہری اعضاء آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں وغیرہ میں معصیت کا فاسد مادہ نہ پھوٹے اور روح و جسم دونوں پاک ہوجائیں، یہاں پر یہ بھی سمجھنا چاہیئے کہ اس عالم میں ہر چیز کا ظہور حق تعالیٰ کے اسماء و صفات کا پرتو ہے۔

چنانچہ ھوالظاھر سے شریعت ہے ھُوالبَاطن سے طریقت ھوالظاھر سے اقرار باللّسان اور ھوالبَاطن سے تصدیق بالقلب، ھوالظاھر سے جسم ہے، ھوالبَاطن سے قلب و روح، ھوالبَاطن سے لاالٰہ الا اللّٰہ ھوالظاھر سے محمد رسول اللّٰہ ھوالظاھر سے شکل دوا ہے۔ ھوالبَاطن سے اثر و شفا ھوالظاھر سے ظہور انبیاء علیہم السلام ھوالبَاطن سے ملائکہ کرام پس جس دوا میں شفا نہیں وہ بیکار ہے اور جس جسم میں روح نہیں وہ کسی کام کا نہیں اور جس دل میں نور تصدیق نہیں وہ لغو ہے۔ مولاناؒ فرماتے ہیں:

چون نہ دارد نور دل دل نیست آن چوں نباشد روح جز وگل نیست آں

جو دل نور باطن سے منور نہ ہو وہ دل دل ہی نہیں ہے اور جب روح ہی جسم میں نہیں تو وہ نہ چیز ہی نہ گل

آں زجاجہ کو نہ دارد نورِ جاں بول قارورہ ست قندیلش مخواں

جس شیشہ میں نور و روشنی نہ ہو وہ قارورہ کی شیشی ہے اسکو قندیل نہ سمجھ

اور جس علم ظاہر کے ساتھ علم باطن نہ ہو تو وہ علم خلوص سے معرا ہے۔

چنانچہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

عالمِ خشک کی صحبت سے بھاگو، عالم خشک سے مراد وہی علماء ہیں جو علم باطن سے بے بہرہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

علم باطن فرض ہے اور طلب طریقت واجب ہے اور بیعت ہونا سنت ہے۔

اولیاء اللہ ضروریات انسانی میں عام لوگوں کے مثل ہیں

اولیاء اللہ کے لئے ان کی صفاتِ بشریہ پردہ ہیں جن چیزوں کے عام لوگ محتاج ہیں یہ بھی ان کے محتاج ہیں، ان کا ولی ہونا ان کو اس احتیاج سے نہیں نکالتا، ان کا غضب بھی اور لوگوں کی مانند ہے جب جناب سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نسبت فرماتے ہیں کہ اغضب کما یغضب البشر، مجھے بھی ویسا ہی غصہ آتا ہے جس طرح اور آدمیوں کو تو پھر اولیاء اللہ کا کیا حال ہے، اسی طرح یہ حضرات کھانے، پینے اور اہل وعیال میں عام لوگوں کے ساتھ شریک ہیں کیونکہ جو چیزیں لوازم بشریت میں داخل ہیں، وہ کسی خاص و عام سے دور نہیں ہو سکتی ہیں۔

حق تعالیٰ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں فرماتا ہے: وما جعلنٰھم جسدًا لا یاکلون الطعام۔ ہم نے ان کے ایسے جسم نہیں بنائے کہ کھانا نہ کھائیں اور کفار ظاہر بین ان کے حق میں کہتے ہیں۔ وما لھٰذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق، اس رسول کو کیا ہے جو کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ پس جس نے اہل اللہ کے ظاہر پر نظر ڈالی وہ محروم ہوگیا اور دنیا و آخرت کا خسارہ اٹھایا اسی ظاہر بینی نے، ابوجہل اور ابولہب کو اسلام کی دولت سے ہمیشہ کے لئے محروم رکھا، سعادتمند وہی ہے جس کی نظر اہل اللہ کی ظاہر سے ہٹ کر ان کی صفات باطنی پر ہو، فھم کنیل مصر بلاءٌ للمحجوبین وماءٌ للمحبوبین پس وہ مثل دریائے نیل کے ہیں کہ وہ محجوبوں کے لئے بلا اور دوستوں کے لئے پانی ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ صفاتِ بشری جس قدر اہل اللہ میں ظاہر ہوتی ہیں دوسرے لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتیں اس کی وجہ یہ ہے کہ صاف ستھری اور ہموار جگہ پر تھوڑی سی ظلمت و کدورت بھی بہت زیادہ دکھائی دیتی ہے، بخلاف اس کے گندی جگہ کی زیادہ سے زیادہ کثافت بھی کم معلوم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود عوام میں صفات بشریت کی ظلمت کلی طور پر سرایت کر کے قالب اور قلب اور روح میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے اور خواص میں ظلمت قالب اور نفس تک ہی محدود ہوتی ہے اور اخص الخواص میں نفس بھی اس ظلمت سے پاک ہے اور یہ ظلمت صرف قالب میں ہوتی ہے۔ نیز یہ ظلمت عوام میں نقصان و خسران کا باعث ہے اور خواص میں کمال اور تازگی کا موجب ہے کیونکہ خواص کی یہی ظلمت عوام کی ظلمت کو دور کر کے ان کے نفس کا تزکیہ کرتی ہے۔ اگر خواص میں یہ ظلمت نہ ہوتی تو افادہ و استفادہ کا راستہ بند ہو جاتا، پھر یہ ظلمت خواص میں اس قدر نہیں ٹھہرتی کہ ان کو مکدر کر دے بلکہ جو ندامت و استغفار اس کے بعد میں حاصل ہوتا ہے وہ دیگر بہت سی ظلمت و کدورت کو بھی دور کر دیتا ہے، یہ ظلمت ملائکہ میں گم ہے جس کے باعث ان کی ترقی کا راستہ بند ہے، ظلمت کا اسم ان پر مدح بما یشبہ الذم کی طرح ہے۔ جاہل عوام اہل اللہ کی صفاتِ بشریہ کو اپنی صفات بشریت کی طرح سمجھ کر محروم رہتے ہیں۔

ان اولیاء اللہ کا باطن خضر کا آبِ حیات ہے کہ جس نے ایک قطرہ اس سے چکھا دائمی زندگی پالی اور ان کا ظاہر سم قاتل ہے کہ جس نے ایک نظر ان کے ظاہر پر ڈالی، ابدی موت میں گرفتار ہو گیا ان کا باطن رحمت ہے اور ان کا ظاہر زحمت وہ ظاہر میں عام انسانوں کی مانند ہیں اور باطن میں خاص فرشتوں کی طرح، ظاہر میں تو زمین پر ہیں باطن میں آسمان پر، ان کا ہمنشیں بدبخت نہیں ہوتا، اور ان کا دوست سعادت مند ہوتا ہے اُولٰئِکَ

حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون۔ یہی لوگ گروہ خداوندی ہیں خبردار یہی گروہ خداوندی خلاصی یافتہ ہے۔

صوفیوں کے غیر مشروع کلمات اور تصوف

صوفیوں کے وجد و حال اور کشف و الہامات کو جب تک کتاب و سنت کی کسوٹی پر نہ گھس لیا جائے اور شریعت کی ترازو میں ان کا وزن نہ معلوم کر لیا جائے وہ بے حقیقت ہیں اور ذرہ برابر ان کا وزن نہیں صوفیائے کرام کے سلوک سے مقصد صرف یہ ہے کہ شرعی عقائد میں جو اہل ایمان ہیں یقین زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو جائے اور احکام فقہ کی ادائیگی میں آسانی حاصل ہو اس کے سوا اور کچھ مقصد نہیں کیونکہ رویت باری یعنے خدا تعالیٰ کا دیدار کا وعدہ آخرت میں ہے اور دنیا میں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ جن مشاہدات و تجلیات پر صوفیہ خوش ہوتے ہیں وہ ظلی اور شبہ و مثال کے طور پر ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ وراء الوریٰ ہے۔ اگر ان تجلیات اور مشاہدات کی حقیقت کما حقہٗ بیان کی جائے تو ڈر ہے کہ مبتدیوں کے شوق و طلب میں فتور و قصور نہ پڑ جائے لیکن باوجود علم کے ان کے بارے میں کچھ بھی نہ کہا جائے تو خوف ہے کہ حق و باطل میں تمیز نہ ہو سکے گی۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ غلبۂ حال کے ظہور سے پہلے اسلام اور کفر کے درمیان تمیز نہ کرنا جس طرح اہلِ شریعت کے نزدیک کفر ہے اسی طرح اہلِ طریقت کے نزدیک بھی کفر ہے۔ اگر اہلِ حقیقت اور اہلِ شریعت کے درمیان کچھ اختلاف ہے تو صرف غلبۂ حال کی صورت میں ہے جیسے منصور حلاج مغلوب الحال تھا تو اہلِ شریعت نے اس کے کفر کا فتویٰ دیا اور اہلِ حقیقت نے کفر پر فتویٰ تو نہیں دیا لیکن اس کو ناقص ضرور

مانا' اور کاملین میں اس کا شمار نہیں کیا، منصور حلاج کا یہ شعر اس پر شاہد عدل ہے۔

کفرتُ بدین اللہ والکفر واجبٌ لدی وعند المسلمین قبیح

میں نے اللہ کے دین کے ساتھ کافرانہ حرکت کی اور میرے نزدیک کفر واجب ہے اور مسلمانوں کے نزدیک برا ہے' الغرض اپنے اوپر غلبۂ حال کے ظاہر ہونے سے پہلے صاحبانِ حال کی تقلید کرنا' بے تمیزی اور شریعت و حقیقت میں الحاد و زندقہ اور کفر ہے حق تعالیٰ ہم کو اور تمام مسلمانوں کو اس قسم کی بے ہودہ اور لغو تقلید سے بچائے قابل تقلید علوم شرعیہ ہیں اور ابدی نجات امام ابوحنیفہ اور امام شافعیؒ جیسے ائمہ شریعت کی تقلید میں ہے۔ جنید اور شبلی وغیرہ کے اقوال دو مصلحت کے لئے مفید ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ احوال ظاہر ہونے سے پہلے ان اقوال کا سننا ان کی طرف شوق پیدا کرتا ہے اور ان سے دلچسپی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ احوال کے ظاہر ہونے کے بعد انہی اقوال کو اپنے احوال کا مصداق بنایا جاتا ہے' ان دو مصلحتوں کے علاوہ ان اقوال کو جاننا اور ان میں غور کرنا منع ہے' ایسی صورت میں زبردست نقصان ہے جہاں ضرر کا گمان ہو عقلمند وہاں قدم نہیں رکھتے پس وہاں کیوں جائیں جہاں اس کا ظن غالب ہو۔

قطب ابدال' اور قطب ارشاد

قطب ابدال اور قطب ارشاد میں بہت بڑا فرق ہے۔ قطب ابدال ان فیوض کے پہونچنے کا واسطہ ہوتا ہے جو اس عالم وجود اور بقا سے تعلق رکھتے ہیں اور قطب ارشاد ان فیوض الٰہیہ کے حصول کا واسطہ ہوتا ہے جو ہدایت اور ارشاد سے متعلق ہیں۔ لہٰذا پیدا ہونا، رزق کا ملنا، آفات وامراض کا دفع ہونا' اور صحت وعافیت کا حاصل ہونا ان فیوض سے وابستہ ہے جو قطب ابدال سے مخصوص ہیں اور ایمان وہدایت اور نیکیوں کی توفیق اور برائیوں سے توبہ قطب ارشاد کے فیوض کا نتیجہ ہے۔

قطب ابدال اپنے کام میں ہر وقت مشغول رہتا ہے اور دنیا کبھی اس سے خالی نہیں رہتی کیونکہ دنیا کا انتظام اس سے متعلق رہتا ہے اگر قطب ابدال کے افراد میں سے کوئی مرجاتا ہے تو اسکی جگہ دوسرا مقرر کیا جاتا ہے لیکن قطب ارشاد کا ہمیشہ موجود ہونا ضروری نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت دنیا ایمان اور ہدایت سے خالی ہو جائے۔

یاد رہے کہ درجۂ ولایت حاصل کرنے کے بعد اقطاب میں کمال کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے۔ قطب ارشاد کا فرد اکمل جناب خاتم الرسل علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے قدم مبارک پر ہے اور اس کا کمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال کے مطابق ہے، البتہ اصلیت اور تبعیت کا فرق ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وقت میں قطب ارشاد تھے، اور خواجہ اویس قرنی اسی وقت میں قطب ابدال تھے۔ دنیا میں قطب سے فیض یوں پہونچتا ہے کہ قطب جامعیتہ حاصلہ کی وجہ سے مبدء فیاض کے لئے صورت اور ظل کی مانند ہے اور تمام جہان اسی قطب جامع کی تفصیل ہے، پس اس کا یہ فیض حقیقت سے صورت کی طرف بے تکلف آتا ہے اور صورت جامع سے جو اس کی تفصیل ہے عالم میں بے تحاشہ فیض پہونچتا ہے۔ فیاض مطلق اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس کے فیض کے پہونچنے میں واسطہ کو چنداں دخل نہیں بلکہ اکثر واسطہ کو اس فیاض سے آگاہی بھی نہیں ہوتی ع از ما و شما بہانہ ساختہ اند

اگر یہ شبہ ہو کہ ایمان و ہدایت عام خلقت کو حاصل نہیں اس لئے قطب ارشاد کے فیوض عام نہ ہوئے بلکہ ہدایت اور ایمان والوں ہی تک منحصر رہے، حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین ہیں، پھر قطب ارشاد کے کیا معنے ہوئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ مبدء فیاض سے ملتا ہے وہ سب کا سب خیر و برکت اور ایمان و ہدایت ہے، شر و نقص کی اس میں مطلق گنجائش نہیں خواہ وہ فیض اہل شقاوت کو پہونچے خواہ اہل

سعادت کو، لیکن وہی ارشاد و ہدایت اہل فساد میں مقام کی گندگی کے باعث گمراہی و خرات پیدا کرتی ہے جس طرح عمدہ غذا مریض کے فاسد مزاج کی وجہ سے اس کے لئے اخلاط ردّی اور مہلک امراض کا مادہ بن جاتی ہے اسی طرح اہل فساد میں بھی ہدایت ان کے دلوں کی گمراہی کی وجہ سے گمراہی پیدا کر دیتی ہے۔ کنیلِ مصر ماءٌ للمحبوبین وبلاءٌ للمحجوبین نیل کی طرح دوستوں کے لئے پانی اور محجوبوں کے لئے بلا ہے یعنی قبطی کے لئے دریائے نیل کا پانی خون معلوم ہوتا ہے جو اس کے خبث باطن کے سبب سے ہے ورنہ اس کا پانی تو صاف ہے، اس میں کوئی فساد نہیں صفراوی مزاج والے کو شیرینی اسی لئے تلخ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا اپنا مزاج بگڑا ہوا ہے جو نہ شیرینی میں کسی قسم کی تلخی نہیں ہے بلکہ صرف محل فاسد کی وجہ سے شیرینی تلخ ہو جاتی ہے، الغرض جو کچھ حق تعالیٰ کی طرف سے پہونچتا ہے، خیر و برکت اور ہدایت ہے اور وہی خیر و برکت محل فاسد میں فساد پیدا کرتی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے وما ظلمهم الله ولكن كانوا انفسهم يظلمون یعنے اللہ تعالیٰ ان پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ قطب ارشاد جو کمالات فردیہ کا جامع ہے بہت نادر الوجود ہوتا ہے۔ صدیوں اور قرنوں کے بعد اس قسم کا گوہر ظہور میں آتا ہے اور عالم اس کے انوار سے منوّر ہوتا ہے اور اس کے ارشاد و ہدایت کا نور عرش سے لیکر فرش تک شامل ہوتا ہے اور جس کسی کو رشد و ہدایت اور ایمان و معرفت کا حصول ہوتا ہے اس کا فیض ہوتا ہے۔ اور اس کے واسطہ کے بغیر کوئی شخص اس دولت کو نہیں پا سکتا یوں سمجھو کہ اس کے نور نے بحر محیط کی طرح تمام جہان کو گھیر رکھا ہے اور بالکل منجمد ہے، اور جو شخص اس بزرگ کی طرف متوجہ ہو کر اس کے ساتھ اخلاص رکھتا ہے یا وہ بزرگ خود طالب کے حال پر متوجہ ہوتا ہے گویا اس طالب کے دل میں نورانی روزن کھل جاتا ہے، پھر وہ توجہ و

اخلاص کے موافق اس دریا سے سیراب ہو جاتا ہے۔

تلاشِ مرشد جبکہ علم باطن کا حاصل کرنا فرض ہے تو اس علم کے عالم کی تلاش بھی ضروری ہو گی لہٰذا مرشد کامل کی کچھ کیفیات معلوم ہونی چاہئیں تاکہ صحیح شناخت کے بعد اس سے فائدہ حاصل کیا جائے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کمالات باطنی کی طلب واجبات میں سے ہے تو پھر پیرِ کامل کی تلاش بھی ضروریات سے ہو گی کیونکہ وصول الی اللہ بلا توسط مرشدِ کامل نہایت بعید اور نادر الوجود ہے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

نفس را نہ کشد بغیر از ظلِ پیر   دامنِ آں نفس کش محکم بگیر

نفس کو بغیر پیر کے سایہ کے نہیں مار سکتا (لہٰذا) نفس کے مارنے والے کا دامن مضبوط پکڑو

اور حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

نیست ممکن در رہِ عشق اے پسر   راہ بُردن بے دلیلِ راہبر

اے عزیز! راہِ عشق میں بغیر دلیل اور راہبر کے چلنا ممکن نہیں ہے

حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے رسالہ مقالۃ الرضیہ فی النصیحۃ والوصیہ کے حاشیہ پر تحریر فرماتے ہیں کہ طالب کو چاہیے کہ علم لدنی کی طلب اور نسبت صوفیا کی تلاش میں رہے نیز اہلِ دل اور شیخ کامل کی جستجو کرے۔

حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیر کامل کا مل جانا محض بخشش رب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت قطب ربانی محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانیؒ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت

مرزا مظہر جانِ جاناں وغیرہم رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور ان کے علاوہ اور ہزاروں اولیاء اللہ شرف بیعت سے مشرف تھے اور یہ اکابر امت اجلہ علماء ہونے کے باوجود کسی نے ایک، کسی نے دو، کسی نے تین اور کسی نے چار مرشد اختیار کئے ہیں اور حضرت محدثین نے جس طرح علم حدیث کا سلسلہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچایا ہے۔ اسی طرح (مرشدانِ طریقت نے بھی اپنا سلسلہ) درجہ بدرجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچایا ہے) جو ان کی کتابوں میں مفصل درج ہے اسی واسطے مولانا روم فرماتے ہیں ؎

ہیچ چیزے خود بخود پیدا نہ شد　　ہیچ آہن خود بخود تیغ نہ شد

کوئی چیز خود بخود پیدا نہ ہوئی　　اور نہ کوئی لوہا خود بخود تلوار بن گیا

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم　　تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

مولوی اسوقت تک مولائے روم نہیں بنا۔ جب تک کہ حضرت شمس تبریزی کا غلام نہ بنگیا

مرشدِ کامل کی شناخت

قرآن وحدیث کی تصریحات اور آئمہ شریعت و طریقت کے اقوال سے ولی کامل کی علامات اور صفات نہایت آسانی سے معلوم ہو سکتی ہیں۔

حق تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے۔ اِنْ اَوْلِیَاؤُہٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ (اگر اس کے ولی ہیں تو وہ صرف متقی ہیں) دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (بیشک تم میں جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے وہی خدا کے نزدیک زیادہ باعزت ہے) تیسری جگہ فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (بے شک اللہ متقیوں کو دوست رکھتا ہے) چوتھی جگہ بشارت ہے وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ غَیْرَ بَعِیْدٍ (اور جنت متقیوں کے واسطے آراستہ کی گئی ہے اور قریب ہے) اس کے علاوہ اور بہت سے مقامات پر حق تعالیٰ نے متقیوں کو اپنا دوست فرمایا ہے۔ متقی وہ ہے کہ

اسے جس کام کا حکم دیا گیا ہو اس پر خلوص سے قائم ہو اور جس چیز سے منع کیا گیا ہو اس کو چھوڑ دیے جو ظاہر و باطن میں متبع سنت ہے در حقیقت وہی متقی اور وہی ولی ہے اور جو باوجود ہوش و تمیز کے اتباع رسول سے غافل ہے وہ ہرگز خدا کا ولی نہیں ہو سکتا چنانچہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید　　　که ہرگز بمنزل نخواہد رسید

جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیخلاف راستہ اختیار کیا۔ وہ ہرگز منزل مقصود کو نہیں پہونچیگا اس زمانہ میں اکثر پیر اپنی وضع قطع خلاف شریعت رکھتے ہیں۔ جیسے نماز نہ پڑھنا، یا گاہے گاہے پڑھنا، داڑھی چڑھانا یا منڈوانا یا کتروانا، مونچھوں کا بڑھا لینا، پائجامے ٹخنوں سے نیچے رکھنا وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ چاروں ائمہ شریعت وائمہ طریقت کے نزدیک ایسا شخص فاسق ہے۔

امام طریقت حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب فیوض یزدانی میں فرماتے ہیں کہ جو شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہ کرے اور ایک ہاتھ سے سنت رسولؐ اور دوسرے ہاتھ سے کتاب اللہ تعالے اور عبادت الٰہی میں اطاعت رسول نہ کرے وہ ہلاک اور گمراہ ہوا صرف کتاب وسنت اللہ کے راستے ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے کہ فاسق کی تعریف کرنے سے عرش معلّٰے کانپتا ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے ان اللہ لا یھدی القوم الفاسقین (بے شک اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا) لیکن جہلا ایسے لوگوں کو ولی جانتے ہیں اور وہ فاسق وفاجر پیر جاہلوں کی زبان سے اپنی ولایت کا تذکرہ سنکر خاموش رہتے ہیں۔ جہلا کہتے ہیں کہ ہمارے میاں صاحب نماز پنجگانہ مکہ شریف پڑھتے ہیں یہاں ان کو نماز پڑھنے کی ضرورت نہیں اور جب کوئی کچھ کہتا ہے

تو مدہوشی کے رنگ میں یہ مصرعہ فرمایا کرتے ہیں ع نماز عاشقاں ترکِ وجود است۔
حق تعالےٰ ایسے گمراہ پیروں سے مسلمانوں کو بچائے اور ان کے ماننے والوں کو صراط مستقیم کی ہدایت فرمائے۔ ان جاہلوں سے کوئی پوچھے کہ کیا عبادات و تکالیف شرعیہ کے ترک کی مجال کسی کو ہے! انبیاء علیہم السلام کیا، صحابہ کیا، ائمہ شریعت ائمہ طریقت یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی عبادت سے مستثنیٰ رہے ہیں جو یہ جاہل اس طرح بکتے پھرتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو فرماتے ہیں کہ اگر موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام بھی میرے زمانے میں ہوتے تو میری پیروی کے سوا ان کے لئے کوئی چارہ نہ ہوتا پھر جاہل پیروں کو عبادت سے چھٹکارا کیسے ہو سکتا ہے، العظمۃ للہ۔
یہ کس قدر بے عقلی کی بات ہے کہ جن متقیوں کو حق تعالیٰ اپنا دوست فرمائے ان کی طرف سے بدظنی ہو اور جن فاسقوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت سے بے بہرہ کر دے ان کو خدا کا دوست بنایا جائے۔ حق تعالیٰ تو ایسے لوگوں کی پیروی سے منع فرمائے اور جاہل بے سمجھ ان کی پیروی کریں۔ ارشاد باری ہے لا تطع منھم آثما او کفورا ؕ (پیروی مت کرو گنہگار یا کافر کی) اگر کسی کو اللہ اور رسول کی محبت کا دعویٰ ہے تو اس آیت کے بموجب رسول کی پیروی کرے۔ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ میری پیروی سے تم کو دوست رکھے گا) دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا (جو کچھ میرا رسول تمہارے پاس لائے تم اس کو لے لو اور جس بات سے منع کرے اس سے باز رہو) مگر ان کا حال یہ ہے کہ جس چیز سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منع فرماتے ہیں اس کو کرتے ہیں اور آپ جس کا حکم دیتے ہیں وہ اس کو چھوڑ دیتے ہیں پھر بھی دعویٰ ولایت کر کے اپنے آپ کو مبداء ہدایت جانتے ہیں۔ ربنا اھدنا الصراط المستقیم، ربنا لا تؤاخذنا ان

نسینا او اخطأنا ۔

بعض لوگ اس پر جمے ہوتے ہیں کہ فلاں سلسلۂ ولایت میں ہمارے خاندان کے لوگ مرید ہوتے آئے ہیں ہم بھی اسی میں مرید ہوں گے اور اکثر پیروں کا طریقہ بھی یہی ہے کہ باپ مرا تو بیٹا گدی نشین بن جاتا ہے اور دستار ان کے سر پر باندھ دی جاتی ہے اس طرح وہ فوراً پیر و مرشد بن جاتا ہے نہ اس نے طریقت سلوک طے کیا ہے اور نہ اس کو باضابطہ طریقت کی اجازت ملی ہے اور نہ ہی وہ اتباع شریعت پر مستحکم ہے مگر مریدوں اور اہل خاندان نے اس کو پیر بنا دیا۔ یاد رہے کہ بلا سلوک و بلا اجازت کے پیر بن کر گدی پر بیٹھ جانا اور لوگوں کو مرید کرنا بالکل غلط اور عقل و نقل کے سراسر خلاف ہے۔ کسی بزرگ کے انتقال کے بعد اس کی اولاد یا اس کے مریدوں میں سے جس نے راہِ سلوک طے کر کے بیعت کرنے کی اجازت حاصل کر لی ہے نیز علمائے طریقت کی تحقیقات کے موافق سب سے لائق ہو اسی کے سر پر دستار باندھنی چاہیے ولایت کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے بلکہ ایک نعمت خداوندی ہے وہ چاہے غلام کو عطا فرمادے یا آقا کو اور مریدی کسی کی غلامی نہیں ہے بلکہ صراطِ مستقیم پر چلنے اور خلوص حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ پس جو لوگ فاسق ہوں اور ان کو خدا اپنا دوست نہ بنائے، ان سے بیعت نہیں ہونا چاہیئے بلکہ ان کی صحبت سے بچنا چاہیئے کیونکہ ان سے فائدہ مفقود اور نقصان ظاہر ہے۔

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

دست ناقص دست شیطان و دیو ۔۔۔ زانکہ اندر دام و تکلیف ست ریو

ناقص کا ہاتھ شیطان کا ہاتھ ہے۔ کیونکہ اس میں سراسر مکاری اور تکلیف ہے۔

ایسے لوگوں کی صحبت میں نہ بیٹھنا چاہیئے اگرچہ ان سے عجیب عجیب باتیں ظاہر ہوں۔ شریعت میں ایسے لوگوں کی ان باتوں کو استدراج کہتے ہیں۔ جیسے دلوں کا حال بیان کرنا۔

دلوں پر اثر ڈالنا، غائب چیزوں کا بتا دینا، خود غائب ہو جانا، شیر کی شکل بن جانا اور ہوا پر اڑنا، یہ سب صفات تو شیطانوں، جوگیوں، برہمنوں اور یونانی فلاسفہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اگر ان ہی چیزوں کا نام ولایت ہے تو شیطان اور کفار کو بھی ولی کہنا پڑے گا، یہی نہیں بلکہ صحابہ کبار رضوان اللہ اجمعین کی ولایت کا انکار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس طرح کے کشف اور خرق عادات ان سے ہر گز ظاہر نہیں ہوئے، حالانکہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم کی ذاتِ مبارک تو کجا، تابعین کے مرتبہ کو بھی کوئی ولی یا امام نہیں پہونچ سکتا، اگرچہ اس سے کتنی ہی کرامتیں اور تصرفات ظاہر ہوئے ہوں۔

قربِ حق، یقینِ کامل، محبت خدا اور رسول اور اتباع سنت کا نام ولایت ہے۔
حضرت مولانا رومی ناقص و کامل کی شناخت یوں فرماتے ہیں۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست ٭ پس بہر دستِ نباید داد دست
بہت سے شیطان آدمی کی شکل میں ہیں۔ پس ہر ایک ہاتھ میں بغیر تحقیق کے ہاتھ نہ دینا چاہئے۔

ہر کہ او از کشف خود گوید سخن ٭ کشف اور ا کفش کن بر سر بزن
جو شخص اپنے کشف کی بات کرے تو اس کے کشف کی جوتی اس کے سر پر مار دو

ما برائے استقامت آمدیم ٭ نے پئے کشف و کرامت آمدیم
ہم شریعت کے احکام پر مضبوط رہنے کے لئے آئے ہیں نہ کہ کشف و کرامت کیلئے آئے ہیں۔

حضرت خواجہ محمد معصوم رح اپنی مشہور کتاب عروۃ الوثقیٰ میں فرماتے ہیں کہ صحبت ناجنس مخالف سے بچو اور بدعتی کی صحبت سے بھاگو اور جو مسند مشیخت پر بیٹھا ہے۔ اور اس کا عمل اس کے خلاف ہو اس سے ہزاروں کوس دور رہو، بلکہ جس بستی میں ایسا شخص

رہتا ہے اس میں تم مت رہو کیونکہ شاید کبھی تمہارا رجحان اس کی طرف ہو جائے اور عقائد میں فرق آجائے وہ پیر نہیں چھپا ہوا چور اور شیطانی پھندا ہے۔ اگرچہ تم اس سے طرح طرح کے خرق عادات دیکھو اور بظاہر دنیا سے بے تعلق معلوم ہو، اس کی صحبت سے اس طرح بھاگو جیسے لوگ شیر سے بھاگتے ہیں۔

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت سب کا مقصد ایک ہی ہے یعنی بندۂ عاصی وخاکی کی بخشش ہو جائے اور اس کا پہلا ذریعہ شریعت کی تابعداری اور اعمال شریعت میں خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ کسی کے حال وقال اور کشف وکرامت پر بخشش کا انحصار نہیں ہے۔ جو حال اور کشف یا خرق عادات متقی سے ظاہر ہو وہ نور ہے اس کو کرامت اور برکت کہیں گے اور اگر خلاف شرع لوگوں سے اس قسم کی باتیں ظاہر ہوں تو اسے استدراج کہتے ہیں۔

جن بزرگوں پر ولایت کے آثار ظاہر ہوتے ہیں ان کی صفات یہ ہیں کہ وہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل اور العلماء ورثۃ الانبیاء کے مصداق ہیں ان کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیکر سینہ کو نورِ باطن سے منور کیا جاتا ہے، ان کا ہاتھ گویا اللہ کا ہاتھ ہے۔

مولانا رومی فرماتے ہیں:۔

چوں ید اللہ فوق ایدیہم بود	دست او را دست خود فرمود احد
جب اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہو	ایسے لوگوں کے ہاتھ کو خدا نے اپنا ہاتھ فرمایا
چوں قبول حق بود آں مرد راست	دست او در کارہا دستِ خداست
جس بندہ کو خدا اپنا مقبول کرے	اس کا ہاتھ تمام کاموں میں گویا خدا کا ہاتھ ہے

وہ متبع سنت ہوں ان کے دیکھنے سے خدا یاد آئے ان کی صحبت میں بیٹھنے سے دنیا کی محبت سرد ہو اور خدا اور رسول کی محبت غالب ہو اور وساوس شیطانی اور خطرات

نفسانی کم ہوں وہ خدا کی عبادت میں اکثر مشغول رہتے ہیں اپنی تعریف نہیں کرتے طامع نہیں ہوتے قانع ہوتے ہیں۔ ضروریات کے سوا فضولیات کو چھوڑتے ہیں۔ ان کی مجلس میں دنیا کی باتیں کم ہوتی ہیں، اکثر ذکرِ خیر ہوتا ہے، ان کے اکثر مریدین نیک ہوتے ہیں اور خدا ورسول کی محبت کا جذبہ رکھتے ہیں، جب یہ صفات کسی بزرگ میں موجود ہوں تو اس سے بیعت کا قصد کرنا چاہیئے لیکن بیعت سے پہلے استخارہ کرنا چاہیئے کیونکہ استخارہ کرنا سنت ہے اور پیرانِ عظام کا یہی طریقہ رہا ہے اگر استخارہ میں اس بزرگ کی خوبی معلوم ہو تو ایسے شخص کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے، انشاء اللہ تعالیٰ اس سے ضرور فائدہ پہونچے گا اور اگر اعمال باطنی کی شامت سے فائدہ نہ بھی پہونچا تو نقصان نہ ہوگا اس کی محبت اور پیروی بخشش کے واسطے انشاء اللہ کافی ہوگی۔ مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر
ہست رہ پُر آفت وخوف وخطر

اپنے لئے مرشد بنا کیونکہ بغیر پیر کے یہ سفر نہایت پر آشوب اور خطرناک ہے یعنی شیطان اور نفس کو اس میں بہت زیادہ دھوکہ دینے کا موقعہ ملتا ہے۔
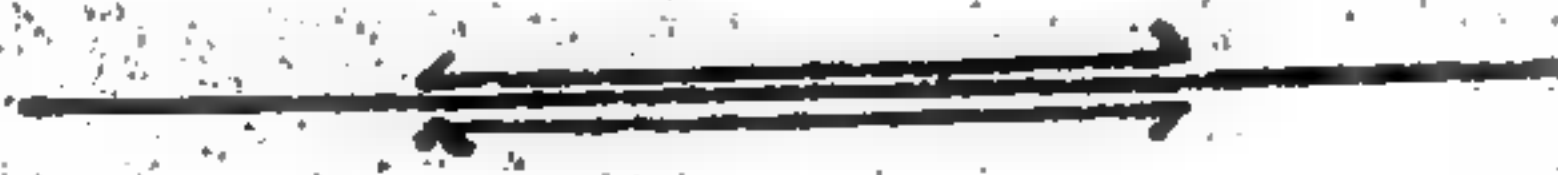
باب دوم

اثبات بیعت

اسلام میں بیعت یہ ہے کہ شریعت کی کسی بات کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام دینے یا کسی خاص دینی مسئلہ پر عمل کرنے کا عہد لیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے مواقع میں ایسا کیا ہے چنانچہ صلح حدیبیہ کے وقت آپ نے صحابہ سے عہد لیا کہ اگر دشمنوں سے مقابلہ ہوا تو جم کر مقابلہ کریں گے اور اسلام کی بلندی کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ سورہ فتح میں ہے:-

لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم واثابھم فتحا قریبا ؕ	اللہ تعالیٰ مسلمانوں سے راضی ہو گیا جب وہ آپ سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے پس اللہ کو معلوم ہو گیا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا اور اس وقت اللہ نے ان کے دلوں میں اطمینان پیدا کیا اور فتح قریب عطا فرمائی۔

قرآن و حدیث میں بہت سے واقعات ہیں جن سے بیعت کا ثبوت ملتا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے یہ سلسلہ اب تک برابر چلا آ رہا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی ہجرت اور جہاد پر کبھی اقامت ارکانِ اسلام یعنی صوم و صلوٰۃ، حج و زکوٰۃ پر کبھی جہاد میں ثبات قدمی پر، کبھی اتباع سنت اور اجتناب بدعت پر، کبھی عبادات کے حرص

اور شائق ہونے پر، کبھی نوحہ نہ کرنے پر اور کبھی لوگوں سے کسی چیز کا سوال نہ کرنے پر بیعت کی ہے،
چنانچہ ان حضرات کا یہ حال تھا کہ اگر کسی کی سواری کا کوڑا زمین پر گر جاتا تھا تو اپنے گھوڑے سے
اتر کر اس کو اٹھا لیتے تھے اور کسی سے کوڑا اٹھا کر دینے کا بھی سوال نہ کرتے تھے اور یہ مسلّم ہے کہ رسول خدا
صلی اللہ علیہ وسلم کا جو فعل بطریق عبادت واہتمام ہو نہ بر سبیل عادت وہ مسنون ہوتا ہے چنانچہ
طریق بیعت بھی سنت نبوی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے اپنی کتاب شفاء العلیل میں استدلال بیعت
پر ایک مستقل فصل تحریر فرمائی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ بیعت سنتِ رسول ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب اپنے رسالہ ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں کہ علم باطن
فرض طلب طریقت واجب، بیعت ہونا سنت ہے اور ہزار ہا علماء و صلحاء نے سلسلۂ طریقت
میں بیعت کی ہے۔ چنانچہ شیخ عبد الحق محدث دہلوی جو ہندوستان میں علم حدیث کے
مرکز ہیں، علم طریقت میں بیعت ہیں، اور علم طریقت میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔
نیز انھوں نے جس طرح علم حدیث کی سند درجہ بدرجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک
پہونچائی ہے اسی طرح علم طریقت کی سند بھی فلاں عن فلاں کہہ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
تک پہونچائی ہے۔ یوں تو شریعت میں بیعت کی بہت سی قسمیں ہیں لیکن صوفیائے کرام
کے یہاں تین قسم کی بیعتوں کا رواج ہے۔

۱۔ بیعت توبہ عن المعاصی ۲۔ بیعت توسل و تبرک، یعنے برکت حاصل کرنے کیلئے
سلسلہ صالحین میں داخل ہونا۔ ۳۔ بیعت کسبِ سلوک جس کا مقصد قربِ حق اور تزکیۂ نفس
ہوتا ہے۔ بیعت توبہ اور بیعت توسل میں مرید کے لئے ضروری ہے کہ کبائر سے اجتناب
کرے اور صغائر پر اصرار نہ کرے اور فرائض و واجبات اور سنن کا پابند رہے ورنہ بیعت شکنی

سمجھا جائے گا۔

بیعت سلوک جس کو بیعت حقیقت بھی کہتے ہیں اس میں ضروری ہے کہ اپنے شیخ اور مرشد کی تعلیم و تلقین کے بموجب اذکار و اشغال، مراقبے، مجاہدات اور ریاضتیں کی جائیں یہاں تک کہ قلب میں نورانیت و طمانیت اور کیفیتِ شہود پیدا ہو جائے۔

حقوق پیر و آدابِ مرید

مذکورہ بالا بیان سے واضح ہو گیا کہ بیعت ہونا سنت ہے اور علم باطن کا حاصل کرنا فرض ہے۔ لہٰذا کسی مرشد کامل سے بیعت ہونے کے بعد حصول فائدہ کے لئے کچھ عرصہ تک اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں باادب رہنا چاہیئے کیونکہ مرشدِ حقیقی درحقیقت نائب رسول ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر شئے سے انسان کا تعلق ہوتا ہے اس تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا ادب ہے اسلام کی تمام بنیاد ادب ہی پر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بے ادب فضلِ رب سے محروم رہتا ہے۔ درحقیقت انسان علم و ادب ہی سے فضیلت حاصل کرتا ہے۔ کسی عربی شاعر نے کہا ہے ؏

شرف الانسان بالعلم والادب — ولا بالمال ولا بالنسب

انسان کی بزرگی علم و ادب سے ہے — نہ کہ مال اور حسب و نسب سے

مرید اپنے شیخ کا ادب جس قدر زیادہ کرے گا اتنی ہی محبت زیادہ بڑھے گی اور جیسے جیسے محبت بڑھتی جائے گی اس کو کمال حاصل ہوتا جائے گا۔ شریعت و طریقت اور تصوف و سلوک سب مجموعۂ آداب ہیں۔ جب تک حقوق و آداب کی رعایت نہ کی جائے گی کچھ حاصل نہ ہو گا۔ بے ادب کسی مقام اور درجہ تک نہیں پہونچتا۔ بلکہ رحمتِ الٰہی سے محروم رہتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از لطف رب
بے ادب خود را نہ تنہا خوار کرد
بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

یعنے ہم خدا سے ادب کی توفیق مانگتے ہیں بے ادب خدا کی رحمت سے محروم رہتا ہے بے ادب صرف اپنے آپ ہی کو خوار نہیں کرتا، بلکہ تمام جہاں کو خراب کرتا ہے۔ شیخ جلال رح فرماتے ہیں۔ من لا ادب لہ لا شریعۃ لہ (جس شخص کے پاس ادب کا حصہ نہیں اس کے پاس شریعت کا حصہ بھی نہیں ہے)۔ شیخ ابو بکر کتانی رح کا قول ہے من لا یتأدب باستاد فھو بطال یعنی جس نے کسی پیر طریقت سے ادب نہیں سیکھا وہ بیکار ہے۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک رح کا مقولہ ہے ادب الخدمۃ اعز من الخدمۃ آداب خدمت کو ملحوظ رکھنا خدمت کرنے سے بڑھ کر ہے۔ یہی بزرگ ایک جگہ فرماتے ہیں زیادہ عمل کی بہ نسبت ہم کو ادب کی زیادہ ضرورت ہے۔

شیخ الشیوخ رح کا قول ہے۔ من لا ادب لہ لا ایمان لہ ولا توحید لہ یعنی جس میں ادب نہیں ہے اس میں ایمان و توحید کچھ بھی نہیں ہے۔

حضرت خواجہ بو علی دقاق رح کا مقولہ ہے: العبد بطاعتہ یصل الی الجنۃ وبادبہ یصل الی اللہ یعنی بندہ اطاعت سے جنت میں پہونچ جاتا ہے اور ادب سے حق سبحانہٗ وتعالیٰ سے پہونچ جاتا ہے۔

خواجہ ابن عطار رح فرماتے ہیں، جو ادب سے محروم رہا وہ تمام کمالات سے محروم رہا۔

حکیم ترمذیؒ اس قدر ادب کرتے تھے کہ .... اعیال کے سامنے ناک بھی صاف نہیں کرتے تھے۔

حضرت محمد ابن فضیلؒ بن عیاض فرماتے ہیں بدبختی کی علامت یہ ہے کہ صالحین کی صحبت نصیب ہو، پھر بھی ان کی عزت و حرمت سے محروم رہے، علم ہو اور عمل نصیب نہ ہو یا عمل کرتا ہو لیکن اخلاص نہ ہو۔

شیخ ابوبکر واسطیؒ فرماتے ہیں کہ اگر میں نے بادشاہ کی خدمت کی ہوتی تو مشائخ کی خدمت نہیں کر سکتا تھا اور اگر مشائخ کی خدمت نہ کی ہوتی تو حق تعالیٰ کی خدمت نہیں کر سکتا تھا۔

شیخ ابو عمر ذغانیؒ فرماتے ہیں کہ میں تیس سال تک حضرت جنیدؒ کے پاخانہ کو اپنے ہاتھ سے صاف کرتا رہا اور میں اس خدمت پر فخر کرتا تھا۔

شیخ محی الدین ابن العربیؒ فرماتے ہیں کہ مرید کو چاہیئے کہ ایسے شخص کی صحبت اور بیعت اختیار کرے جس کی عزت و عقیدت اس کے دل میں ہو، مجبور ہو کر کسی کے ہاتھ پر بیعت نہ کرے اور شیخ کی طرف سے جو کچھ دیکھے اس پر اعتراض نہ کرے بلکہ اس کے اسرار سے واقفیت حاصل کرے اور اس کے ظاہر کلام پر اکتفاء کرے تاکہ اشارات پر ترقی کر جائے اور اپنے کو تمام مریدوں میں سب سے کمتر سمجھے اور اپنے نفس کو شیخ کے آداب کے علاوہ کسی دوسرے امر میں مشغول نہ کرے اور شیخ کے سجادہ پر پاؤں نہ رکھے اور نہ بغیر اجازت اس کے کپڑے وغیرہ استعمال کرے۔ اگر دل میں کوئی خطرہ یا سوال پیدا ہو تو اس کو بلا قیل و قال شیخ پر ظاہر کر دے۔

مرید سالک کو چاہیئے کہ شیخ کے تلقین کردہ ذکر سے اپنے قلب کو آباد رکھے غفلت ہونے یا برا خیال گذرنے پر شیخ کی طرف رجوع کرے۔ اسی طرح اگر کبھی کوئی لغزش ہو جائے تو شیخ کے حکم پر عمل کرے۔

اپنے شیخ کے ساتھ ایسا ہو جیسے مردہ غسّال کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور توبہ کی تلقین پانے کے بعد گرسنگی، بے خوابی، خاموشی اور گوشہ نشینی کی عادت ڈالے اور شیخ کے کلام میں جدال نہ کرے، اہل طریقت کے نزدیک شیخ سے جدال کرنے والا مرید ہوائے نفس میں غرق ہے، جس فعل مباح سے شیخ نے منع کیا ہو اس میں علماء کے اقوال سے حجت لانا مرید کی بدبختی کی علامت ہے۔ ایسا مرید فلاح نہیں پا سکتا، مرید پر لازم ہے کہ اپنے شیخ کے طریقہ کو سب طریقوں سے اعلیٰ اور افضل سمجھے ورنہ دوسرے طریقوں کا شوق ہو جائے گا اور یہ بات اسکے حق میں مضر ہوگی۔ مرید کو اپنے شیخ کے سامنے اس طرح خائف اور لرزاں بیٹھنا چاہیئے گویا چور کو سزا کے لئے لایا گیا ہے۔ اپنے شیخ کو برحق جانے اور اس کے حکم کو بلا توقف بجالائے بلکہ اگر نماز نفل در پیش ہو تو اس کو چھوڑ کر پہلے شیخ کا حکم بجالائے۔ مرید کے دل میں اس قسم کی خواہش کا پیدا ہونا کہ لوگ اس کی تعظیم کے لئے آئیں اور اس سے برکت حاصل کریں نہایت مہلک اور ضرر رساں ہے۔

مرید باصفا پر لازم ہے کہ اپنے شیخ و مرشد کے بارے میں یقین رکھے کہ وہ عالم باللہ ہے اور خلق اللہ کے لئے ناصح اور مشفق ہے مگر اس کو معصوم نہ جانے کیونکہ عصمت صرف خاصہ انبیاء کرام و ملائکہ ہے۔

منقول ہے کہ ایک بزرگ سے کوئی برا اور ناجائز فعل سرزد ہو گیا۔ انھوں نے اپنے مرید سے کہا کہ بھائی تو نے مجھ سے ایسا فعل سرزد ہوتے ہوئے دیکھ لیا ہے اب تو مجھ سے الگ ہو جا اور کسی دوسرے شیخ کی صحبت میں چلا جا، مرید نے کہا حضرت میرے دل میں تو اس کا وسوسہ بھی نہیں گزرا میں نے تو آپ کی صحبت عالم باللہ اور ناصح مشفق ہونے کی وجہ سے اختیار کی ہے اور میں آپ کو عالم طریقت جانتا تھا نہ کہ معصوم، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس

مرید پر ایسا حال مفتوح ہوا کہ وہ اپنے زمانہ کا شیخ کامل بن گیا۔ مرید پر یہ بھی لازم ہے کہ اپنے شیخ کے اسرار کو پوشیدہ رکھے اور بلا اجازت ظاہر نہ کرے۔

حضرت شیخ نظام الدین اولیا فرماتے ہیں کہ راہِ طریقت میں آفات و بلیات سات قسم پر ہیں۔ اعراض ۔ حجاب ۔ تفاصل ۔ سلب مزید ۔ سلب قدیم ۔ تسلی ۔ عداوت۔

اعراض یہ ہے کہ مرید سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا جو مرشد کو ناپسند ہو اور اس کی وجہ سے شیخ مرید سے منہ پھیر لے اگر مرید اس فعل سے توبہ کر کے باز آجائے تو یہ اعراض اقبال سے بدل جاتا ہے اور رشتہ محبت قائم ہو جاتا ہے۔

حجاب یہ ہے کہ مرید اپنے اس فعل پر مصر رہے اس کی وجہ سے وہ اپنے شیخ سے محجوب ہو جائے گا۔

تفاصل یہ ہے کہ مرید کو اس حجاب پر بھی تنبیہ نہ ہوئی ہو اور نہ اس نے توبہ اور عذر خواہی کی ایسی صورت میں شیخ مرید سے جدائی اختیار کر لیتا ہے۔

سلب مزید یہ ہے کہ اس جدائی کے باوجود مرید متنبہ نہ ہوا تو سلب مزید ہو جائیگا، یعنی نوافل و اذکار اور وظائف میں فتور پڑ جائے گا۔

سلب قدیم یہ ہے کہ مرید اس سے بھی باز نہ آئے تو سلب قدیم ظاہر ہو جاتا ہے یعنی وہ فرائض و واجبات کے ادا کرنے میں سست ہو جاتا ہے اور طاعات کی توفیق اور اس کی لذت اس سے زائل ہو جاتی ہے۔

تسلی یہ ہے کہ اگر مرید اب بھی توبہ نہ کرے تو تباہ کن تسلی پیدا ہو جاتی ہے یعنی فرائض و واجبات کے فوت ہو جانے پر اس کو کوئی غم یا ندامت نہیں ہوتی بلکہ اس کا دل شیخ کی جدائی پر آرام پا جاتا ہے۔

عداوت یہ ہے کہ اگر مرید اسی طرح غفلت اور سستی میں پڑا رہے تو باہمی عداوت پیدا ہو جاتی ہے اور دوستی کا معاملہ دشمنی سے بدل جاتا ہے۔ نعوذ باللہ منہ۔

جواہر السلوک میں ہے کہ مرید مبتدی کا کام ماسوی اللہ کا ترک اور اپنے اوقات کا ذکر اللہ، صوم وصلوٰۃ اور خدمت اصحاب سے معمور کرنا ہے اور مرید متوسط کا کام خارجی طہارت کے ساتھ ساتھ باطنی طہارت کا حاصل کرنا بھی ہے۔ صرف تلاوت قرآن پاک اور صوم وصلوٰۃ تک ہی اس کا کام محدود نہیں رہنا چاہیئے کیونکہ الاشغال بالعلوم الشرعیۃ و تلاوۃ القرآن امور حسنۃ ولکن شان الطالب شان آخر یعنی علوم شریعت اور تلاوت قرآن میں مشغول ہونا بے شک اچھا کام ہے لیکن طالب کی شان کچھ اور ہے یعنی یہ کہ تمام صفات رذیلہ مثل ہوائے نفس، حرص، بخل، کبر، حسد، ریا وسمعہ، خیانت، حب مال وجاہ، حب ماکول ومشروب، حب مدح وذم اور خیر وشر وغیرہ سے اس کا باطن پاک وصاف ہو کر تمام اخلاق حمیدہ سے متصف ہو جائے اور جو چیز بھی اس کو یاد خدا اور مشاہدۂ حق سے مانع ہو اس کا دور کرنا ضروری ہے۔ مرید کے لئے ضروری ہے کہ جو بھی نعمت ظاہری و باطنی اس کو کسی جگہ سے حاصل ہو اس کو اپنے پیر ہی کا طفیل جانے اور اسی کا شکر گزار ہو۔ چنانچہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دولت ونعمت اگر بظاہر کسی جگہ سے حاصل ہو مگر اس کو اپنے پیر ہی کا طفیل سمجھے وہ بہر صورت جامع ہے جو تربیت بھی ظہور میں آتی ہے وہ درحقیقت اسی کی طرف سے ہوتی ہے۔

ظاہری اور باطنی ارکان تصوف

مجمع السلوک میں ہے کہ تصوف کے پانچ ارکان ظاہری اور پانچ باطنی ہیں جب تک مرید سالک میں یہ ظاہری و باطنی ارکان جمع نہ ہوں اس کو صوفی نہیں کہہ سکتے۔

اِذرکن الشئي مایقوم به الشئي وبفوته یفوت ذالك الشئي یعنی رکن کسی چیز کا وہی کہلاتا ہے جس سے وہ چیز قائم اور موجود ہو اور اس کے فوت ہو جانے سے وہ چیز بھی فوت ہو جاتی ہے۔

ارکان خمسہ ظاہری یہ ہیں۔ اول کمزوروں، دینی بھائیوں اور مرشد کی خدمت بجا لانا۔ دوم کسی مرشد سے خرقۂ ارادت حاصل کرنا۔ سوم طاعت وعبادت میں خلوت اختیار کرنا اور ذکر و فکر اور مراقبہ میں مشغول ہونا۔ چہارم اپنے پیر کی صحبت میں وقت گذارنا اور حقِ صحبت ادا کرنا۔ پنجم سخاوت میں جوانمردی کرنا اور بذل و ایثار سے پیش آنا۔

ارکان خمسہ باطنی یہ ہیں: اول شریعت وطریقت کے احکام کا علم حاصل کرنا۔ دوسرے ان پر صدق و اخلاص سے عمل کرنا۔ تیسرے اپنے باطن میں حال کا پیدا کرنا۔ چوتھے مقام دل میں پہونچنا۔ پانچویں حق تعالیٰ کی معرفت حاصل ہونا۔

شیخ کیلئے آداب

شیخ کے لئے ضروری ہے کہ جب کوئی شخص طریق طریقت میں داخل ہونے کے لئے آئے تو پہلے اس کے حق میں استخارہ کرے یا اپنے دل کی قبولیت پائے تو اس کو داخل طریقت کرے پھر مجمل طور پر اس کو توبہ کا طریقہ بتلائے اور تفصیل کو بعد کے لئے چھوڑ دے کیونکہ اس زمانے میں ہمتیں بہت پست ہو گئی ہیں اگر ابتدا ہی میں اس کو مفصل طور پر توبہ کی تکلیف دی جائے گی تو بہت زیادہ وقت درکار ہو گا اور بہت ممکن ہے کہ اس قدر مدت کی وجہ سے اس کی طلب میں فتور پیدا ہو جائے اور اصل مطلب سے رک جائے۔ اس کے بعد اس کی استعداد کے مناسب طریقہ کی تعلیم دے اور اس کی قابلیت کو دیکھ کر ذکر تلقین فرمائے اس کی طرف توجہ اور اس کے حال پر نظر التفات رکھے اور اس کو طریقت کے آداب و شرائط بتائے اور کتاب وسنت کی تابعداری اور سلف صالحین کی پیروی کی ترغیب دے اور تاکید کرے کہ ان کی تابعداری کے بغیر مطلوب تک

پہونچنا دشوار ہے اور یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر دے کہ جو کشف اور واقعات کتاب وسنت کے ذرا بھی مخالف ہوں ان کا مطلق اعتبار نہ کرے نیز یہ کہ اپنے عقائد کو فرقہ ناجیہ اہلسنت والجماعت کے عقائد کے موافق درست کرے اور فقہ کے ضروری مسائل اور احکام سیکھے اور ان کے مطابق عمل کرے کیونکہ طریقت میں اعتقاد اور عمل کے دو بازوؤں کے بغیر اڑنا نہایت مشکل اور محال و دشوار ہے اور مرید کو تاکید کرے کہ لقمۂ حرام و مشتبہ میں پوری پوری احتیاط کرے ایسا نہ کرے کہ جو کچھ جہاں کہیں سے ہاتھ لگا جھٹ کھالیا۔ بلکہ جب تک شریعت اس کے کھانے کا فتویٰ نہ دے ہرگز نہ کھائے۔

غرض تمام امور میں آیۂ کریمہ وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا کے موافق عمل کرے۔

صاحبان ارشاد اور پیران طریقت کے لئے ضروری ہے کہ ان سے کوئی ایسا فعل سرزد نہ ہو جو مخلوقات کی نفرت کا باعث ہو کیونکہ اس میں وبال عظیم ہے۔ خلقت کی نفرت فرقۂ ملامتیہ کے مناسب حال ہے جن کو شیخیت اور دعوتِ خلق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مقام ارشاد مقام ملامت کے بالکل برخلاف ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان دونوں متضاد مقامات کو باہم مخلوط کر دیں اور مشیخت میں ملامت کی آرزو کریں یہ نہایت درجہ کا ظلم ہوگا اور اپنے کو مریدوں کی نظر میں باسلیقہ اور ہوشمند رکھیں اور حد سے زیادہ ان سے میل جول نہ رکھیں یہ امر خفت اور سبکی کا باعث ہے جو افادہ اور استفادہ کے قطعاً منافی ہے۔ حدود شریعہ کی حفاظت میں نہایت درجہ اہتمام کریں جہاں تک ہو سکے رخصت پر عمل نہ کریں۔ بلکہ عزیمت کو اختیار کریں۔

ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ریاءُ العارفین خیرٌ من اخلاص المریدین یعنی عارفوں کی ریا مریدوں کے اخلاص سے بہتر ہے۔ کیونکہ عارفین کی ریا بھی طالبین کے دلوں کو بارگاہِ

الہٰی کی طرف کھینچنے کے لئے ہوتی ہے ایسی ریا یقیناً مریدوں کے اخلاص سے بہتر ہوگی اور عارفوں کے اعمال طالبوں کے لئے موجب تقلید ہیں۔ اگر عارفین خود عمل نہ کریں گے تو طالبین محروم رہ جائیں گے۔ عارفین اگر ریا کرتے ہیں تو اس لئے کرتے ہیں کہ مریدان کی اقتدا کریں۔ اس طرح یہ ریا عین اخلاص ہے۔ بلکہ یہ ریا اس اخلاص سے جو محض اپنے ذاتی فائدہ کے لئے کیا جائے بہتر ہے۔ اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے کہ عرفا محض طالبین کے دکھلانے اور تقلید کرانے کے لئے عمل کرتے ہیں ورنہ ان کو عمل کرنے کی مطلق حاجت نہیں۔ نعوذ باللہ یہ گمان تو عین الحاد و زندقہ ہے۔ عمل کے بغیر کسی کو بھی چارہ نہیں ہے۔ عارفین عمل کرنے میں طالبین کے بالکل مساوی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ عارفین کے اعمال میں بعض اوقات طالبین کا نفع ملحوظ ہوتا ہے' اسی اعتبار سے اس کو ریا کہہ دیا جاتا ہے' ایسا نہیں ہے کہ صرف تقلید کرانے پر ان کا عمل منحصر ہو'

الغرض صاحبان ارشاد کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اپنے قول و فعل میں نہایت احتیاط سے کام لیں۔ اکثر لوگ اس زمانے میں جنگ و جدال کے درپے ہو جاتے ہیں لہٰذا کوئی ایسا امر سرزد نہ ہونا چاہیئے جو اس مقام کے منافی ہو اور جہلا کو بزرگان دین کے حق میں زبان طعن دراز کرنے کا موقعہ مل جائے۔ نیز عارفین ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت کے طالب اور بارگاہِ ایزدی میں ذلیل و محتاج بنکر عاجزی اور گریہ وزاری اور التجا کرتے رہیں۔ بندوں کے وظائف کو بجالاتے رہیں۔ حدود شرعیہ کی پوری پوری محافظت اور سنت نبوی کی متابعت کرتے رہیں نیکیوں کے حاصل کرنے میں نیت درست رکھیں۔ ان کے باطن میں اخلاص اور ظاہر میں تسلیم ہو' اپنے عیوب کو دیکھتے رہیں اور گناہوں کی کثرت کے خیال سے حق تعالیٰ کے انتقام کا خوف دلوں پر غالب رہے اپنی نیکیوں کو بہت کم سمجھیں اگرچہ زیادہ ہوں اور اپنی برائیوں کو بہت زیادہ جانیں اگرچہ تھوڑی ہوں اور خلقت کے اندر قبولیت اور شہرت سے

ڈرتے رہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آدمی کے لئے اتنا ہی شر کافی ہے کہ دین و دنیا میں انگشت نمائی کے قابل ہو جائے مگر حق تعالیٰ محفوظ رکھے اور احوال واردہ کی طرف التفات نہ کریں اگرچہ وہ بالکل صحیح اور واقع کے مطابق ہوں صرف دین کی تائید اور مذہب کی تقویت اور شریعت کی ترویج میں لگے رہیں۔ مرید کے مال اور دنیاوی منافع میں طمع اور حرص پیدا نہ ہونے پائے۔ فرمان نبوی ہے۔ حب الدنیا رأس کل خطیئۃ یعنی دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے۔

تکرار بیعت بعض صورتوں میں تکرار بیعت جائز اور بعض حالات میں ضروری ہے، لیکن اس زمانے میں بعض پیر طمع نفسانی اور کسر شان کی وجہ سے اپنے مریدوں کو طریقت کا غلط مسئلہ بتلاتے ہیں کہ اب ہمارے سوا کسی اور بزرگ کی طرف رجوع نہ کرنا، تم اب ہمارے جھنڈے کے نیچے آچکے ہو اس لئے اب دوسری جگہ بیعت نہیں ہو سکتے، ورنہ ہم تمہارا نام مریدوں کے دفتر سے کاٹ دیں گے اور تمہاری شفاعت نہ کریں گے۔ غرضیکہ اس قسم کی بہت سی لغو باتیں جاہلوں کو سمجھاتے ہیں جن کی کوئی اصل نہیں بلکہ یہ محض ان خود غرض اور حریص پیروں کی شرارتِ نفس اور ناواقف مریدوں کو دھوکہ دینا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحؒ نے اپنے تمام مریدوں سے فرمایا کہ خدا نے ایک سے ایک اچھے انسان پیدا کئے ہیں تم مجھ سے بہتر شیخ تلاش کرو، اس پر اکثر مریدوں نے عرض کیا کہ آپ کو چھوڑ کر ہم کہیں نہیں جائیں گے اور کچھ اشخاص نے تلاش کے بعد واپس آکر عرض کیا کہ آپ جیسا بزرگ ہم کو نہیں ملا۔ درحقیقت یہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی انتہائی بے نفسی اور کمال کا ثبوت ہے جن کی ایک توجہ سے نان بائی آپ کا ہمشکل بن جائے اور قرب حق میں درجہ کمال کو پہونچ جائے اور جن کے خلیفہ حضرت مجدد الف ثانی جیسے حضرات ہوں، ان کا ایسا

فرمانا کمال بے نفسی کی بین دلیل ہے اسی وجہ سے آپ کو خواجۂ بے نفس بھی کہا جاتا ہے۔

اکثر اکابر شریعت اور بزرگان طریقت نے متعدد مشائخ سے بیعت کی ہے اور بعض نے ایک ہی پر قناعت کی ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی، حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہید رحمۃ اللہ علیہم اجمعین اور دیگر اکابر دین نے کئی کئی پیروں سے بیعت کی ہے۔ ایسا اس وقت کیا جاتا ہے جبکہ پہلے پیر کا انتقال ہو گیا یا ایک پیر سے ایک سلسلہ کا سلوک تکمیل کے بعد ختم ہو جائے یا پیر سے ہمیشہ کے لئے دوری ہو جائے یا پیر نے جو ذکر و فکر بتایا تھا اس پر حسب ارشاد دو تین برس شب و روز عامل رہے۔ مگر قرب حق میں فائدہ نہ پائے یا کم پائے یا عقائد اور معاملات کو خراب پائے، ان تمام صورتوں میں دوسرے پیر سے بیعت کر سکتا ہے بلکہ طالب حق کو ان حالات میں دوسرا پیر اختیار کرنا نہایت ضروری ہے لیکن جو شخص اس واسطے کسی بزرگ سے بیعت ہوا ہو کہ میں اس بزرگ کے ہاتھ پر توبہ کر کے آئندہ گناہوں سے اجتناب کروں یا اس بزرگ کی ذات دنیا و آخرت میں میرا وسیلہ بنے تو بیعت اول کو "بیعت توبہ" اور دوسری بیعت کو "بیعت توسل" کہتے ہیں ان دونوں قسم کی بیعت کرنے والوں کو کسی اور پیر سے بیعت ہونے کی ضرورت نہیں نیز جس طالب حق کو اپنے شیخ سے باطنی فائدہ پہونچ رہا ہے اس کا بھی بلا وجہ ادھر ادھر شیخ کی تلاش کرنا، اور جگہ جگہ مرید ہونا بوالہوسی اور نہایت بری بات ہے ایسے آدمی کو ہرجائی کہا جاتا ہے۔ جو نہایت مذموم اور قبیح ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کسب سلوک کے لئے بیعت ہوا ہے تو اسے مذکورہ بالا صورتوں میں دوسری جگہ بیعت ہو کر قرب حق حاصل کرنا چاہیئے۔ بیعت توبہ اور بیعت توسل میں تکرار بیعت کی ضرورت نہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ سے کسی نے سوال کیا کہ پیر کے زندہ ہونے کے باوجود اگر کوئی شخص

طلب حق کے واسطے کسی دوسرے پیر کے پاس جائے تو کیا یہ جائز ہے؟ آپ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ مقصود قرب حق تعالیٰ ہے اور پیر اس کے لئے وسیلہ ہے اگر کوئی طالب خدا اپنی ہدایت کا راستہ دوسرے پیر کے پاس دیکھے اور اپنے دل کو اس کی صحبت و محبت میں یکسو پائے تو جائز ہے کہ پیر کی حیات میں اس کی اجازت کے بغیر دوسرے پیر کے پاس جا کر ہدایت حاصل کرے۔ مگر پہلے پیر اول کا منکر نہ ہو اور اسے عزت و احترام کے ساتھ یاد رکھے، اس زمانہ میں عام طور پر پیری اور مریدی ایک رسم اور عادت بن گئی ہے اور اکثر پیروں کو اپنے احوال تک کی خبر نہیں ہوتی بلکہ وہ ایمان و کفر میں تمیز بھی نہیں کر سکتے۔

جو مرید اس طرح کے پیر پر اعتقاد کر کے بیٹھ جائے اور دوسرے پیر کے پاس جا کر وصول الی اللہ کی صحیح راہ تلاش نہ کرے، اس پر افسوس صد افسوس ہے۔ اس قسم کے شیطانی خطرات ناقص پیر کی وجہ سے طالب حق کو حق تعالیٰ سے جدا کرتے ہیں اس لئے طالب حق کو چاہیئے کہ جس جگہ کھلی ہوئی ہدایت پائے بلا توقف اس کی طرف رجوع کرے اور وسوسہ شیطانی سے پناہ مانگے۔

حضرت خواجہ نقشبندؒ نے مشائخ بخارا سے اس بات کا فتویٰ حاصل کر لیا ہے کہ مرید اگر ایک پیر سے خرقہ ارادت لے، دوسرے سے تعلیم حاصل کرے اور تیسرے کی صحبت سے استفادہ کرے تو یہ جائز ہے، ہاں اگر یہ تینوں نعمتیں ایک جگہ ہی ملجائیں تو بہت بڑی نعمت ہے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص ہمارے پیر کی طرح کامل پیر رکھتا ہو، اس کو دوسرے پیر کے پاس نہیں جانا چاہیئے مگر پیر ناقص سے ضرور علیحدہ ہو کر دوسرے پیر کی طرف رجوع کرنا چاہیئے کیونکہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کی خدمت

اور صحبت میں بیٹھا جائے بلکہ ایسے پیر کی صحبت میں بیٹھنا اپنی استعداد کو ضائع کرنا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اپنی کتاب قول الجمیل میں فرماتے ہیں کہ تکرار بیعت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نیز حضرات صوفیاؒ سے منقول ہے۔
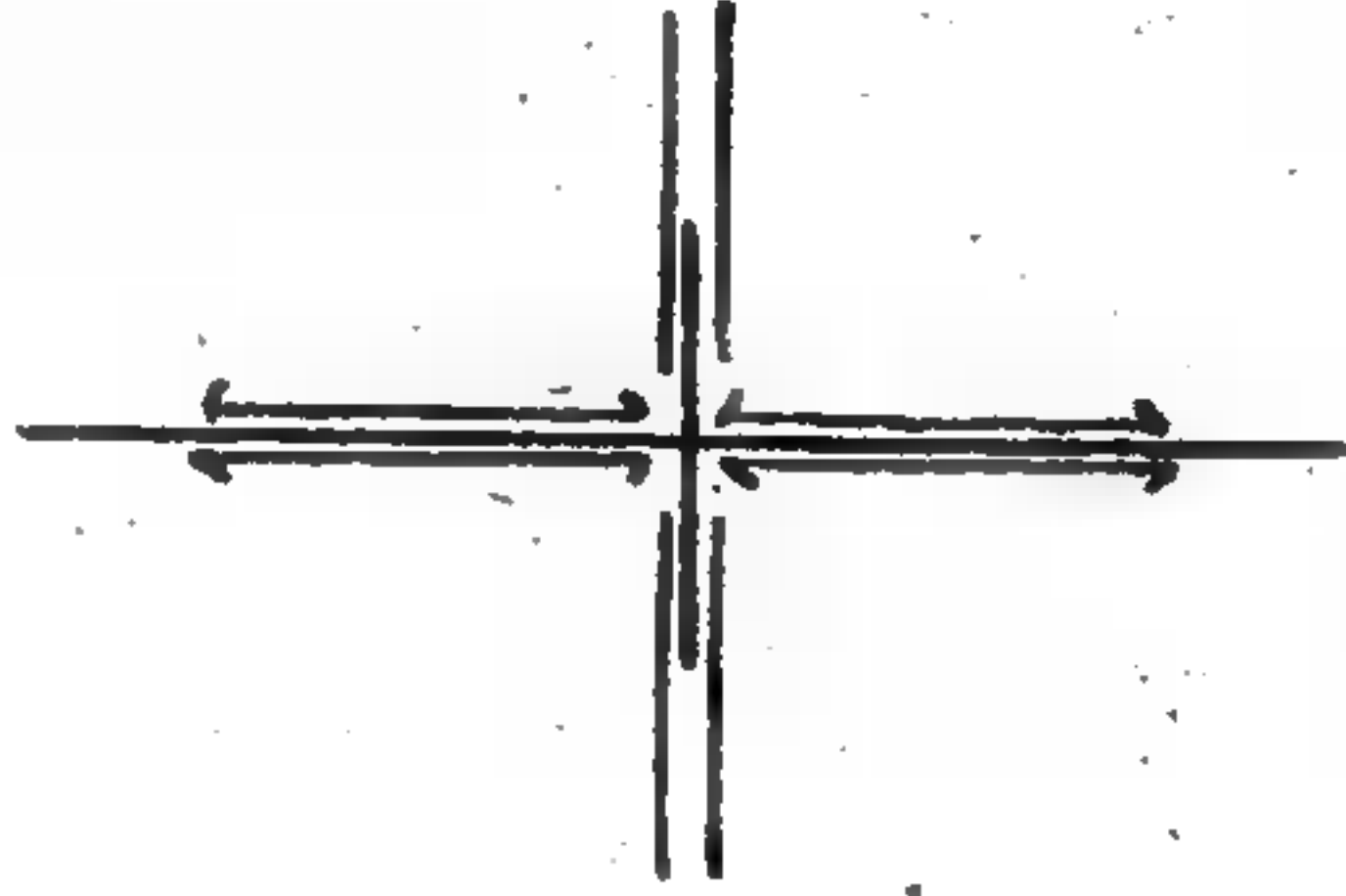
باب سوم

مشائخ کے سلسلے

جو خاص طور پر ہندوستان میں جاری ہیں

سلسلہ نقشبندیہ^۱، سلسلہ قادریہ^۲، سلسلہ چشتیہ^۳، سلسلہ سہروردیہ^۴۔

سلسلہ نقشبندیہ | قدامت کے اعتبار سے سب سے پہلے ہے۔ یہ سلسلہ ترکستان میں قائم ہوا اور اس کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ خواجہ محمد اتا یسوی المتوفی سنہ ۱۱۶۶ء ہیں۔ ترکی زبان میں اتا باپ کو کہتے ہیں جو بزرگی کی وجہ سے مشائخ کے ساتھ لگایا گیا ہے۔

یسا ترکستان میں ایک شہر تھا جہاں حضرت خواجہ محمد رحمۃ اللہ علیہ نے قیام کیا تھا، ان کے بعد حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی المتوفی سنہ ۱۱۷۹ء نے اس سلسلہ کی مندرجہ ذیل آٹھ اصلاحات وضع کیں اور ان کو اپنے روحانی نظام کا لازمی جز بنا دیا۔ حق یہ ہے کہ انھوں نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا، ان کے بعد حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبندؒ نے مزید تین اصطلاحات وضع فرمائی ہیں اس طرح اس طریقہ کی بنیاد گیارہ اصطلاحات و کلمات پر ہو گئی۔

۱۔ ہوش در دم ۲۔ نظر بر قدم ۳۔ سفر در وطن ۴۔ خلوت در انجمن
۵۔ یاد کرد ۶۔ باز گشت ۷۔ نگہداشت ۸۔ یاد داشت ۹۔ وقوف زمانی

۱۰۔ وقوف قلبی ۱۱۔ وقوف عددی

اب ان اصطلاحات کی شرح اور تفصیل یوں ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) (ہوش در دم) ہر سانس میں ہوشیار رہنا، یعنی یہ خیال رکھنا کہ کوئی سانس اللہ تعالیٰ کی یاد سے نہ خالی جائے اور نہ معصیت میں گزرے۔

(۲) (نظر بر قدم) چلنے پھرنے میں اپنی نظر نیچی کر کے پیروں پر نگاہ رکھے۔ ادھر ادھر نہ دیکھے کیونکہ آس پاس میں جو چیزیں دکھائی دیتی ہیں ان کی طرف توجہ ہونے سے توجہ الی اللہ میں خلل پڑتا ہے اور خیالات منتشر ہوتے ہیں اس سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ برائی اور نیکی کے قدم کو دیکھے کہ کس میں قدم آگے ہے اگر برائی میں قدم آگے ہے تو اس کو پیچھے ہٹائے اور نیکی کے قدم کو آگے بڑھائے نیز اس سے سلوک باطن بھی مراد ہو سکتا ہے یعنی اپنے قرب اور ولایت کو دیکھے کہ کس مقام پر ہے اور اس سے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔

(۳) (سفر در وطن) اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی صفات بشریہ اور اخلاق رذیلہ کو چھوڑ کر صفات ملکیہ اور اخلاق فاضلہ کو حاصل کرے یعنی طلب جاہ و مال و عجب و حسد و بغض و کینہ و تکبر وغیرہ سے دل کو پاک کرے کیونکہ جب تک یہ خصائل رذیلہ دل میں ہوں گے۔ نور خدا دل میں نہیں آسکتا۔ اسی کو حضرت شاہ بو علی قلندرؒ فرماتے ہیں ؎

صد تمنا در دلا داری فضول | کے کند نورِ خدا در دل نزول

تو سینکڑوں آرزوئیں لغو دل میں رکھتا ہے (تو پھر) خدا کا نور تیرے دل میں کیسے نازل ہوگا

حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں:

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں | ایں خیال است و محال است و جنوں

یہ محض خیال اور جنون اور محال بات ہے کہ تو خدا کو بھی چاہتا ہے اور ذلیل دنیا کو بھی

خدا کے سوا جس چیز کی محبت ہے، یہی بت ہے جب تک دل کے بت خانہ کو توڑ کر خانۂ خدا نہ بنائے گا آدمی عند اللہ بت پرست کہلائے گا۔ بو علی شاہ قلندرؒ فرماتے ہیں:

بُت پرستی میکنی ہم بُت گری شد دلت رشکِ بتاں آذری

تو بت پرستی کرتا اور بت بناتا بھی ہے، تیرا دل تو آذر کے بتوں کے لئے باعث رشک ہے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں کہ سفر در وطن سے مراد یہ ہے کہ سیر آفاقی کو چھوڑ کر سیرِ اَنفُسی کی طرف سفر کرے۔

دوسرے طریقوں میں سالک کو سیرِ آفاقی کرنی پڑتی ہے مگر طریقۂ نقشبندیہ میں سیرِ آفاقی بلا ضرورت ممنوع ہے۔ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے سیرِ اَنفُسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔

④ (خلوت در انجمن) لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بھی اپنے وطنِ اصلی کی طرف متوجہ رہنا اور اللہ کی یاد سے غافل نہ ہونا۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ (میرے بندے وہ لوگ ہیں جن کو سوداگری اور لین دین میرے ذکر سے غافل نہیں کرتا)

"دل بیار دست بکار" دراصل اسی آیت کا ترجمہ ہے۔ ایک بزرگ اسی حالت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

از دروں شو آشنا و از بروں بیگانہ وش

اندر یعنے دل میں خدا کی یاد رکھ اور ظاہر میں بیگانہ بنا رہ

ایں چنیں زیبا روش کم می بود اندر جہاں

یہ عمدہ روش دنیا میں بہت کم ہے

⑤ (یاد کرد) اپنے قلب کی طرف متوجہ ہونا اور خیال کرنا کہ قلب سے اللہ اللہ نکل رہا ہے یعنی سالک ہمیشہ اللہ کا ذکر کرے۔ اسم ذات کا یا نفی و اثبات کا یعنی کلمہ شریف

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا کہ جو اپنے مرشد سے پہونچا ہو اور ذکر اس قدر کرے کہ حق تعالیٰ کی حضوری حاصل ہو جائے۔ حضرت خواجہ نقشبند فرماتے ہیں کہ مقصود ذکر سے یہ ہے کہ دل ہمیشہ حضرت حق کے ساتھ حاضر رہے بوصف محبت و تعظیم۔

(۶) (بازگشت) اس سے مراد یہ ہے کہ تھوڑے تھوڑے ذکر کے بعد تین بار یا پانچ بار مناجات کی طرف رجوع کرے اس موقع کے لئے حضرت خواجہ نقشبند کی مناجات یہ ہے: "الٰہی مقصود من توئی و رضائے تو محبت و معرفت خود عطا فرما۔"

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم صاحبؒ اس دعا کے بار بار پڑھنے کو شرط عظیم فرماتے تھے نیز فرماتے تھے کہ طالب کو لازم ہے کہ اس سے غافل نہ رہے۔ ہم نے جو کچھ پایا ہے اسی کی برکت سے پایا ہے۔ اس دعا کا مقصد یہ ہے کہ سالک کو جو ذکر و فکر سے کوئی سرور یا کوئی نور یا کوئی چیز عالم غیب کی نظر آئے تو وہ اس پر مغرور ہو کر اس کو اپنا مقصد نہ سمجھ لے کیونکہ ذات خدا تو کجا اسماء و صفات الٰہی میں سے کسی ایک میں لاکھوں برس تک سالک کی سیر رہے جب بھی ختم نہ ہو، لہٰذا یہ دعا سب کو قطع کر کے ذات حق سے قریب کرتی ہے۔

(۷) (نگہداشت) ذکر سے جو کیفیت پیدا ہو اس کو قائم رکھنا اور خطرات و وسوسوں سے اپنے قلب کو بچانا یعنی جو خیالات اور وساوس غیر خدا کے دل میں آئیں ان کو سالک نہ آنے دے اسی واسطے حضرت خواجہ نقشبندؒ فرماتے ہیں کہ سالک کو چاہیے کہ خطرہ کو ابتداء ظہور ہی میں روک دے ورنہ نفس اس کی طرف مائل ہو جائے گا کیونکہ جب وہ خطرہ نفس میں اثر کر جائے گا تو اس کا دور کرنا بہت مشکل ہو گا ؎

نہیں ممکن کہ خطرہ غیر کا دل میں کبھی آئے   کسی کی یاد میں سب کچھ بھلانا اس کو کہتے ہیں

⑧ (یاد داشت) جب ذکر کی اس قدر مشق ہو جائے کہ بے ارادہ اور بے اختیار دل سے اللہ اللہ نکلنے لگے تو اس کو یاد داشت کہتے ہیں۔ ابتدا میں جو چیز یاد کرد کہی جاتی ہے انتہاء میں وہی چیز یاد داشت کہی جاتی ہے۔ درحقیقت یاد داشت کی منزل میں پہونچ کر طالب اس آیت کریمہ کا صحیح مصداق ہو جاتا ہے۔" رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیعٌ عن ذکر اللہ۔"

⑨ (وقوفِ زمانی) اس کی شرح ہوش در دم میں گزر چکی ہے۔ ہوش در دم اور وقوف زمانی کا مطلب قریب قریب ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مبتدی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا کوئی سانس غفلت میں نہ گزرے، یہاں تک اسے سنبھالے کہ حضورِ دائمی کو پہونچ جائے۔ وقوف زمانی متوسط کے واسطے مناسب ہے تاکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سنبھال سکے۔ وقوف زمانی کو صوفیہ کرام "محاسبہ" بھی کہتے ہیں۔

⑪ (وقوف عددی) وقوف عددی سے مراد یہ ہے کہ سالک ذکر کرتے وقت اس امر پر واقف رہے کہ جب ذکر اللہ کرے تو وتر یعنی طاق کرے جیسے ۳، ۵، ۷، ۹ مرتبہ۔ اس میں ذاتِ حق کے ساتھ مناسبت ہے کیونکہ ارشاد نبویؐ ہے "اللہ وترٌ یحب الوتر" خدا ایک ہے اور اکائی کو پسند کرتا ہے۔

⑩ (وقوفِ قلبی) وقوف قلبی سے مراد یہ ہے کہ سالک ہر وقت ہر آن ہر لحظہ اپنے قلب کی طرف متوجہ رہے اور قلب خدا کی طرف متوجہ رہے تاکہ سب طرف سے توجہ ہٹ کر معبود حقیقی کی طرف ہو جائے اور کسی قسم کے خطرات اور وسوسے دل میں نہ آئیں۔ خصوصاً ذکر کے وقت اس کا پورا پورا خیال رکھے۔ اسی واسطے حضرت خواجہ نقش بندؒ نے حبس دم اور رعایت عدد کو ذکر میں لازم نہیں فرمایا بلکہ اسے فوائد میں داخل

کیا ہے اور وقوف قلبی تو حضرت خواجہ کے نزدیک نہایت ضروری اور رکن عظیم ہے اور اسی پر طریقۂ نقشبندیہ کا تمام تر دار و مدار ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

علیٰ بیض قلبك کن کأنك طائر   فمن ذالك الاحوال فیك تولّد

اپنے دل کے انڈے پر پرندے کی طرح بیٹھ جا، کیونکہ اسی طریقہ سے تیرے دل میں نور خدا پیدا ہوگا۔

تنبیہ: کلمات و اصطلاحاتِ نقشبندیہ کی مختصر تشریح کر دی گئی، اگر کوئی شخص چاہے کہ میں صرف ان کو دیکھ کر از خود ذکر و فکر کروں اور اس طرح میری تکمیل ہو جائے تو یہ بات نوادر میں سے ہے اور بلا شیخ کے طریقت کے راستہ میں چلنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ مولانا جلال الدین رومی فرماتے ہیں ؎

کارِ بے استاد خواہی ساختن   جاہلانہ جاں بخواہی باختن

بغیر استاد کے اگر تو کام بنانا چاہے گا تو کامیابی ممکن نہیں بلکہ جاہلوں کی طرح جان پر کھیلنا چاہتا ہے۔

درحقیقت خواجہ آتا اور خواجہ غجدوانی رحمۃ اللہ علیہما نے اس سلسلہ کو فروغ دینے کے لئے بہت کوششیں کی ہیں، لیکن اس کو مقبول عام بنانے کا شرف حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقش بند رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۸ء) کے لئے مقدر ہو چکا تھا اور انہی کے نام سے یہ سلسلہ نقشبندیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اگرچہ یہ سلسلہ سب سے قدیم ہے لیکن ہندوستان میں یہ سلسلہ سب سلسلوں کے بعد پہنچا ہے۔ حضرت خواجہ باقی باللہ رح (المتوفی ۱۶۰۳ء) اس کو ہندوستان میں لائے، چنانچہ حضرت خواجہ خود فرمایا کرتے تھے۔

ایں تخم پاک را از سمرقند و بخارا آوردیم، در زمین برکت آگین ہند کشتیم۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کے عزیز مرید اور خلیفۂ خاص حضرت شیخ احمد المعروف

یہ مجدد الف ثانی (المتوفی ۱۰۳۴ھ ۱۶۲۴ء) نے اس سلسلہ کو ہندوستان میں ترقی دی اور ان ہی کے بعد یہ سلسلہ مجددیہ نقشبندیہ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

سلسلہ قادریہ۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے کے سرخیل ہیں۔ حضرت شیخ نے اپنی زندگی ہی میں اصلاح و تربیت کا نہایت اعلیٰ نظام قائم کر دیا اور اپنے خلفاء کو دور دراز تبلیغ و اشاعت کے لیے بھیج دیا پھر ان کے بعد اسلامی ممالک کے دور دراز حصوں میں اس سلسلہ کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں قادریہ سلسلہ ہندوستان میں قائم ہوا۔ اس سلسلہ کو حضرت شاہ نعمت اللہ قادری نے ہندوستان میں قائم کیا۔ حضرت سید محمد غوث گیلانی، مخدوم شیخ عبدالقادر ثانی، سید موسیٰ، شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم نے سلسلہ قادریہ کو ہندوستان میں عہد مغلیہ میں زیادہ فروغ دیا۔

سلسلہ چشتیہ۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری (المتوفی ۶۳۳ھ) رحمۃ اللہ علیہ، پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان تشریف لائے اور شہر اجمیر کو اپنا مستقر بنا کر اپنے سلسلے کا کام شروع کیا۔ ہندوستان کی تاریخ کے ابتدائی دور میں مسلمانانِ ہند میں یہی سلسلہ جاری ہوا اور اسی کی خانقاہیں پاک پٹن سے لیکر لکھنؤ، دہلی اور دیوگیر وغیرہ میں قائم ہوئیں۔

حضرت خواجہ چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر خلفاء جیسے حضرت قطب الدین بختیار کاکی، حضرت فریدالدین گنج شکر، حضرت جمال الدین ہانسوی، حضرت نظام الدین محبوب الٰہی، حضرت مخدوم علی احمد صابری کلیری، حضرت نصیرالدین چراغ دہلوی وغیرہم رحمہم اللہ علیہم اجمعین کے ذریعہ سلسلہ چشتیہ کو ہندوستان میں بہت زیادہ فروغ ہوا۔

سہروردیہ۔ اس سلسلہ کے سب سے زیادہ مشہور بزرگ حضرت شیخ

شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۴ء) ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ کی ترویج واشاعت نہایت محنت سے کی اور اپنی مشہور کتاب **عوارف المعارف** میں خانقاہی نظام کے متعلق پوری تفصیلات درج کیں۔ ہندوستان میں انھوں نے اپنے بہت سے مرید بھیجے تھے۔ ان کا مشہور مقولہ ہے کہ خلفائی فی الھند کثیرۃ۔ شیخ نورالدین مبارک غزنوی، مولانا مجدالدین حاجی، شیخ ضیاءالدین رومی، قاضی حمیدالدین ناگوری رحمہم اللہ علیہم ان کے مشہور خلفاء تھے۔ لیکن جس بزرگ کو ہندوستان میں سہروردیہ سلسلہ کے پھیلانے کا شرف حاصل ہوا وہ شیخ بہاؤالدین ذکریا ملتانی رح ہیں انھوں نے ملتان اور دیگر مقامات پر سلسلہ سہروردیہ کی مشہور خانقاہیں قائم کیں، نیز اسی زمانے میں جبکہ یہ دو سلسلے چشتیہ اور سہروردیہ ہندوستان میں قائم تھے، ایک اور سلسلہ فردوسیہ سرزمین ہند میں قائم ہوا۔

سلسلہ فردوسیہ: اس سلسلہ کو ہندوستان میں لانے والے شیخ بدرالدین سمرقندی رح خلیفۂ شیخ سیف الدین باخرزی رحمۃ اللہ علیہ تھے لیکن اس کو پروان چڑھانے کا کام حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ نے انجام دیا ان کے مکتوبات، تصوف کا نہایت بیش قیمت ذخیرہ ہیں۔ یہ سلسلہ فردوسیہ بہار تک محدود رہا اور آگے نہ بڑھ سکا۔

پندرھویں صدی عیسوی کے وسط میں جبکہ قادریہ سلسلہ ہندوستان میں قائم ہوا اسی زمانے میں ایک اور سلسلہ شطاریہ قائم ہوا۔

سلسلہ شطاریہ: اس سلسلہ کو حضرت شاہ عبداللہ شطاری رح (المتوفی ۱۴۵۸ء) نے قائم کیا تھا۔ حضرت سید محمد غوث گوالیاری رح اور شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی رح نے اس کو ہندوستان میں ترقی دی۔ البتہ جہانگیر کے بعد اس سلسلہ کا اثر بہت کم ہو گیا تھا۔

درحقیقت مسلمانانِ ہند کی روحانی زندگی کی اصلاح اور تربیت کا کام انہیں چھ سلسلوں نے انجام دیا ہے۔

ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں مندرجہ ذیل روحانی سلسلوں نے کام کیا ہے:۔

۱۔حبیبیان ۲۔طیفوریان ۳۔کرخیان ۴۔سقطیان ۵۔جنیدیان،
۶۔گازرونیان ۷۔طوسیان ۸۔فردوسیان ۹۔سہروردیان ۱۰۔زیدیان
۱۱۔عباسیان ۱۲۔ادھمیان ۱۳۔ہبریان ۱۴۔چشتیان۔

یہ فہرست ضرورت سے زیادہ طویل ہے اور اس میں اکثر ایسے سلاسل بھی شامل ہیں جنھیں درحقیقت ہندوستان میں کام کرنے کا موقع ملا ہی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے چشتیہ سلسلہ کی داغ بیل رکھی گئی۔ پھر سہروردی سلسلہ ہندوستان میں پہونچا اور اسی زمانے میں سلسلہ فردوسیہ جو بہار تک محدود رہا قائم ہوا۔

اس کے بعد قادریہ سلسلہ اور شطاریہ سلسلہ چلا اور اکبر کے عہد میں حضرت خواجہ باقی باللہ نے نقشبندیہ سلسلہ ہندوستان میں قائم کیا۔ اس طرح یہ چھ مشہور سلسلے ہندوستان میں قائم ہوئے اور یہاں پر انھوں نے کام کیا۔

مذکورہ بالا سلسلوں میں منازل سلوک کے اعتبار سے کچھ تھوڑا سا فرق ہے۔ مثلاً حضرات نقشبندیہ مجددیہ نے ترقی اور قربِ حق کے واسطے تمام تر دارومدار ذکر قلبی اور ذکر خفی پر رکھا ہے بخلاف دوسرے سلاسل چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ کے کہ انہوں نے ذکر لسانی سے سلوک شروع کیا ہے نیز ان حضرات کے یہاں سیر آفاقی اور حضرات

نقشبندیہ کے یہاں سیرِ انفسی اور دوسرے حضرات کے یہاں سلوک مقدم ہے اور نقشبندیہ کے یہاں جذب مقدم ہے تمام سلاسل مبارکہ میں زیادہ تر ذکر اسم ذات اور نفی واثبات کو لیا ہے اور اکثر حضرات نقشبندیہ نے اسم ذات کے ذکر کو لیا ہے یا صرف فکر ذات کو جس سے مراد وقوف قلبی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کلمۂ توحید کے ذکر سے سلوک طے ہوتا ہے اور ذکر اسم ذات سے جذب پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات نقشبندیہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سلوک کو مؤخر اور جذب ربانی کو مقدم رکھتے ہیں۔

باب چہارم

فضائل و ترغیبِ ذکر

سب سے اعلیٰ اور عمدہ بشارت رب العالمین کی بندہ کے واسطے فاذکرونی اذکرکم ہے (یعنی اے میرے بندو! تم یاد کرو مجھ کو میں یاد کروں گا تم کو) درحقیقت اس ارشاد خداوندی پر لاکھوں بلکہ بے شمار جانیں تو کیا اگر تمام خلق بھی قربان ہو جائے تو کم ہے دنیا کا کوئی معمولی حاکم یا رئیس وقت اپنے سے ادنیٰ کو یاد کرتا ہے تو ادنیٰ کے لئے کس قدر مقام فخر اور خوشی کا باعث ہوتا ہے، چہ جائیکہ رب العالمین خالق ارض و سما اپنے بندۂ ناچیز کو یاد فرمائے۔

حدیث شریف میں ہے کہ جنت میں جنتیوں کو کوئی افسوس اور حسرت نہ ہوگی مگر اس وقت کی جو دنیا میں خدا کی یاد سے غفلت میں گذرا ہوگا۔

صحیح حدیث میں وارد ہے کہ کوئی شخص گود بھر کر سونا چاندی خدا کے راستہ میں صدقہ و خیرات کرے اس سے بہتر وہ شخص ہے، جو خدا کا ذکر کرے۔ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے اور صدقہ دینے سے اللہ کا ذکر بہتر ہے۔ حدیث میں ہے اللہ کا ذکر کرنے والا زندہ ہے اور ذکر حق سے غافل مردہ ہے۔

ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ مجھ کو ایسی

چیز بتلائیے جو میرے لئے کافی ہو، آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنی زبان کو ہمیشہ اللہ کی یاد میں تر رکھو۔

حضرت معاذؓ نے خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس حالت میں دنیا سے جاؤ کہ تمھاری زبان اللہ کے ذکر میں تر ہو۔ نیز ارشادِ نبویؐ ہے کہ آدمی کا کوئی عمل ذکر اللہ سے زیادہ عذابِ خداوندی سے نجات دلانے والا نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تم ذکر خدا سے غافل نہ ہو، اگر غافل ہوگئے تو رحمتِ الٰہی تم کو بھلا دے گی۔

تنبیہہ: تر زبان سے مراد دل کی زبان بھی ہو سکتی ہے کیونکہ دل کی زبان کسی وقت بھی خشک اور بند نہیں ہوتی بخلاف مُنہ کی زبان کے کہ وہ بعض اوقات ذکر اللہ سے غافل ہو جاتی ہے۔ درحقیقت تمام انبیاء و اولیاء کو کثرت ذکر ہی سے ترقیات حاصل ہوتی ہیں۔ یہی ذکر ہے جو ذاکر بندہ کو مذکور یعنی حق تعالیٰ تک پہونچاتا ہے۔ ذکر اللہ آئینۂ قلب کی صیقل ہے اور طالبانِ محبت کے زخم کا مرہم اور روح کی غذا ہے۔ ذکر اللہ دنیا سے دُور اور خدا سے قریب کرتا ہے۔ ذکر اللہ جہنم سے دور کرتا ہے اور جنّت سے قریب کرتا ہے۔ ذکر اللہ دنیا کی تمام نعمتوں سے بہتر اور اعلیٰ ہے۔ ذکر حق ہی وہ چیز ہے جو حق تعالیٰ کے انوار سے وصل اور مخلوقِ فانی سے فصل کراتا ہے اور دائمی زندگی عطا کرتا ہے۔

حکیم سنائی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دل تو حقیقتاً وہی ہے جو ذکر حق اور انوارِ الٰہی سے معمور ہو اور حق تعالیٰ اسکو نظرِ رحمت سے دیکھے اور جس دل میں فضول خیالات بھرے ہوں وہ دل بھوتوں کا گھر ہے، حقیقتاً وہ دل نہیں ہے۔

تنبیہہ: بعض طالبانِ مولیٰ کو ذکر اسم ذات، بعض کو صرف فکر ذات، بعض کو ذکر نفی و اثبات، بعض کو تلاوت قرآن مجید، بعض کو کثرت نوافل اور بعض کو کثرت درود

شریف مفید اور نفع بخش ہوتی ہے۔ حساس اور باشعور شیخ جس طالب کو جو نسخہ مناسب سمجھے استعمال کرائے۔

ھدایت: مرشد کو چاہیئے کہ جس طالب کا جسم بلغمی ہو یا جس کو گھی، دودھ، بادام وغیرہ اور مقویات میسر ہوں اس کو حبس دم کی تعلیم دے یہ اس کے حق میں مفید ہوگا۔ اور جس کے جسم میں خشکی ہو یا مرغن اور چکنی غذا کھانے کو نہ ملتی ہو اس کو حبس دم نہیں بتانا چاہیئے: اس کے لئے طریقۂ عناداری ذکر کے وقت مناسب ہوگا۔

طریقۂ عناداری طریقۂ عناداری یہ ہے کہ اول سانس کو پوری طرح اندر کو کھینچ لیا جائے اور اس کو باہر آتے وقت آہستہ آہستہ چھوڑا جائے اگر اس طریقہ کو ہمہ وقت قائم رکھا جائے تب بھی یہ نقصان دہ نہیں ہے اسی واسطے حضرت خواجہ نقشبند فرماتے ہیں کہ چرب بخور و کار خوب بساز یعنی کھانا مرغن کھاؤ اور یادِ خدا خوب کرو۔

ھدایت: ذکر قلبی میں بہت زیادہ کوشش کرنی چاہیئے جس قدر ذکر قلبی قوی ہوگا اسی قدر سلطان الاذکار قوی ہوگا اور پھر ہر ایک مقام میں ترقی اور نسبت قوی ہوگی۔

طالب اور مرشد دونوں اس ذکر قلبی سے جلد ترقی کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بلکہ اس میں ذرا توقف سے کام لیں اور خوب پختہ ہو جانے پر آگے سلطان الاذکار کی طرف بڑھنا چاہیئے۔ درحقیقت ذکر قلبی قاعدۂ بغدادی کی طرح ہے جو بچہ قاعدہ روانی سے پڑھ لیگا وہ قرآن شریف پڑھنے میں بھی تیز اور رواں ہوگا اور جس بچہ کی حروف شناسی اور قاعدہ کی روانی کم اور کچی ہوگی وہ قرآن مجید کی عبارت کو ٹھیر ٹھیر کر اور غلط طور پر پڑھے گا یہی حال ذکر قلبی کا ہے۔

منازل سلوک طے کرانے کے سلسلہ میں تمام سلاسل میں ذکر اسم ذات اللّٰہ کو اور ذکر نفی و اثبات لا الٰہ الا اللّٰہ کو اختیار کیا گیا ہے۔ ذکر اسم ذات اللہ کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اکثر محققین اس اسم ذات کو اسم اعظم کہتے ہیں نیز اس کے علاوہ جس قدر اسماء و صفات باری تعالیٰ ہیں ان کا ایک حرف کم کر دینے سے وہ اسم بے معنی ہو جاتا ہے مثلاً رحیم سے را اور کریم سے ک کم کر دیا جائے تو حیم اور ریم بے معنی رہ جاتا ہے علیٰ ہذا القیاس دوسرے اسماء اور اسم ذات اللّٰہ کا ہر ایک حرف ذات باری تعالیٰ کو بتلاتا ہے۔ جیسے اللّٰہ کا الف گرا دینے سے للّٰہ رہ جاتا ہے اور لِلّٰہ کا لام گرا دینے سے لہ بن جاتا ہے اور لہ کا لام کم کر دینے سے ہُ رہ جاتا ہے یعنی وہ ذات علام الغیوب جو لفظ حرف اور معنی سے پاک اور برتر ہے۔ سبحانہ تعالیٰ عما یصفون یعنی وہ ذات برتر اور پاک ہے کہ تم اس کو پکارو اور موصوف کرو اسم ذات بے نقط اور ہر حرف اس کا بامعنی ہے۔ اور مشائخ ذکر نفی و اثبات لا الٰہ الا اللّٰہ کی تلقین اس لئے کرتے ہیں کہ اس کے متعلق ارشاد نبوی ہے: افضل الذکر لا الٰہ الا اللّٰہ۔

حضرات چشتیہ کے اذکار و اشغال

مشائخ طریقت نے تصفیہ قلب اور تجلیہ روح کے واسطے سالک کے لئے سب سے پہلے بارہ تسبیح ذکر جہری میں تجویز فرمائی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے توبہ و استغفار، عجز و انکساری اور حضور قلب کے ساتھ بارگاہ ایزدی میں دعا کرے تین یا پانچ یا سات بار اللّٰھم طھر قلبی عن غیرک ونور قلبی بنور معرفتک ابداً یا اللّٰہ یا اللّٰہ یا اللّٰہ کہے اور دو زانو (نماز میں بیٹھنے کی طرح) بیٹھے یا چار زانوں اس طرح بیٹھے کہ داہنے پاؤں کے انگوٹھے اور اس کے پاس کی انگلی سے رگ کیماس کو

جو بائیں زانوں کے اندر ہے مضبوط پکڑے اور کمر سیدھی رکھے اور دلجمعی و خوش محالی کے ساتھ ذکر شروع کرے۔

طریقہ ذکر نفی و اثبات

سر کو قلب کی طرف (جو بائیں پستان سے تقریباً دو انگشت نیچے ہے) جھکا کر قوت و شدت کے ساتھ دل کے اندر سے کلمہ **لا** کو کھینچکر سر کو اور **آلہ** تک داہنے مونڈھے پر لیجا کر پشت کی طرف مائل کر کے اور تصور کرتے ہوئے کہ غیر اللہ کو قلب سے نکال کر پشت پر ڈال دیا ہے، سانس کو چھوڑ کر سختی سے لفظ **اِلا اللہ** کی ضرب دل پر لگائے اس تصور کے ساتھ کہ میں عشق و نورِ الٰہی کو دل میں داخل کیا اس طرح نفی و اثبات کے اس ذکر کو دو سو مرتبہ ادا کرے اور تھوڑی دیر کے بعد **لا الہ الا اللہ** کے ساتھ **محمد رسول اللہ** بھی کہے۔

مبتدی کلمہ **لا الہ** میں **لا** معبود کا اور متوسط **لا** مقصود کا اور منتہی **لا** موجود کا تصور کرے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر مراقب ہو کر تصور کرے کہ فیضانِ الٰہی عرش سے میرے سینے میں آتا ہے۔

طریقہ ذکر اثبات مجرد

دو زانو بیٹھے اور کمر کو سیدھا رکھے اور سر کو داہنے مونڈھے پر لیجا کر لفظ **اِلا اللہ** کو زور اور سختی سے دل پر ضرب لگائے اس کو چار سو بار کرے پھر حسب سابق تھوڑی دیر مراقب رہے۔

طریقہ ذکر اسم ذات

پھر ذکر اسم ذات **اللہ اللہ** کا اس طرح کرے کہ اول لفظ **اَللّٰہُ** کی ھاء کو ضمہ یعنی پیش اور دوسری ھاء لفظ **اللہ** کو ساکن کرے یعنی جزم دے اور آنکھیں بند کر کے اور سر کو داہنے مونڈھے

پر لا کر لفظ مبارک اللّٰہُ اللّٰہ کی دونوں ضرب جہر اور قوت سے دل پر مارے اس طرح ذکر اسم ذات دوضربی کو چھ سو بار دمادم کرے اس ذکر کے وقت تھوڑی تھوڑی دیر میں اللہ حاضری، اللہ ناظری، اللہ معی کے معنی کا تصور کرتا رہے تاکہ ذکر کی کیفیت و لذت حاصل ہو اور غفلت دفع ہو۔ اس کے بعد ایک ضربی ذکر اس طرح کرے کہ سر کو داہنی جانب مونڈھے کی طرف کج کر کے لفظ مبارک اللّٰہ کو ایک سو بار ضرب کرے اس طرح ذکر جہر بارہ تسبیح سے فارغ ہو کر دعا اور مناجات کرے۔ الٰہی تو ہی مقصود ہے اور رضا تیری مطلوب ہے، میں نے دنیا و آخرت کو تیرے واسطے ترک کیا مجھ کو اپنی نعمتیں عطا فرما اور وصول الی اللہ کی دولت بخش آمین ثم آمین۔

طریقہ ذکر پاس انفاس

سالک اور طالب کے لئے ضروری ہے کہ اپنے انفاس یعنی سانسوں پر یوں آگاہ اور ہوشیار رہے کہ بغیر ذکر اللہ کے کوئی سانس نہ گذرے، اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ سانس کے باہر نکلنے کے وقت لَآ اِلٰہ اور اندر داخل ہوتے وقت اِلَّا اللّٰہ کہے لیکن اس میں منہ اور زبان بند ہوگی صرف خیال اور تصور سے ذکر کیا جائے گا اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لفظ مبارک اللّٰہ کو سانس کے ساتھ اوپر کھینچے اور لفظ ھو کے ساتھ سانس کو چھوڑ دے اس طرح ذکر کی اس قدر کثرت اور مشق ہونی چاہیئے کہ ذاکر کا کوئی سانس ذکر سے خالی نہ جائے۔

ذکر اسم ذات لسانی

سالک کو چاہیئے کہ باوجود ذکر پاس انفاس کے اسم ذات کو زبانی ہر روز چوبیس ہزار مرتبہ کہے یہ اوسط مرتبہ ہے، اور اگر اس قدر نہ ہو سکے تو چھ ہزار سے کم نہ کرے، یہ ادنیٰ مرتبہ ہے اور اعلیٰ مرتبہ ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔

مشائخ جیلانیہؒ کے اشغال و اذکار

مشائخ قادریہ سب سے پہلے ذکر بالجہر یعنی بلند آواز سے ذکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس میں افراط نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ درمیانی آواز سے ہو۔

ذکر بالجہر اسم ذات اس کی مندرجہ ذیل چار صورتیں ہیں:
ایک ضربی۔ دو ضربی۔ سہ ضربی۔ چہار ضربی

طریقہ ذکر یک ضربی اس کا طریقہ یہ ہے کہ لفظ مبارک اللہ وسط سینہ سے شدت اور بلند آواز سے نکال کر اپنے منہ کے سامنے ضرب لگائے اور اس لفظ مبارک کا تلفظ کرتے وقت خیال کرے کہ اس کے ہمراہ ایک نور اس کے منہ سے نکلا ہے جس نے تمام بدن کو سر سے پاؤں تک احاطہ کر لیا ہے اور نماز کی ہیئت پر دو زانو بیٹھ کر اس ذکر کو کثرت سے لگاتار کرتا رہے۔

ذکر دو ضربی دو زانو بیٹھ کر لفظ مبارک اللہ کو وسط سینہ سے زور سے بلند آواز کے ساتھ نکال کر داہنے زانو میں ضرب کرے اور پھر اس کو سینے کے درمیان سے نکال کر اور شانے تک کھینچ کر دل پر شدت سے ضرب لگائے اس ذکر کو کثرت سے کرے۔

ذکر سہ ضربی چار زانو بیٹھ کر ایک ضرب داہنی طرف طریقہ مذکور پر لگائے اور دوسری ضرب بائیں جانب زانو پر اور تیسری ضرب قلب میں لگائے۔

ذکر چہار ضربی اس کا طریقہ یہ ہے کہ چار زانو بیٹھ کر طریق مذکور پر ایک ضرب داہنی جانب زانو میں لگائے اور دوسری بائیں جانب زانو میں اور تیسری

دل میں اور چوتھی اپنے روبرو یعنی سامنے کی جانب لگائے۔

ذکر جہری نفی واثبات

یہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز کی طرح قبلہ رو بیٹھ کر آنکھ بند کرے اور لا کو اپنے ناف سے نکال کر اپنے داہنے مونڈھے تک کھینچے پھر الٰہ یوں کہے گویا اس کو دماغ کی جھلّی سے نکالتا ہے، پھر قوت کے ساتھ الا اللہ کی ضرب قلب پر لگائے اور لفظ لا نکالتے وقت مبتدی نفی محبوبیت کا، متوسط نفی مقصودیت کا اور منتہی نفی موجودیت کا تصور کرے اور الا اللہ کی ضرب کے وقت اثبات کا تصور کرے۔

مشائخ قادریہ کے یہاں حلقۂ ذکر بھی اجتماعی ہیئت کے ساتھ بعد نماز فجر اور عصر تجویز کیا گیا ہے کیونکہ بعض فوائد اس میں وہ ہیں جو تنہائی میں نہیں ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ مشائخ چشتیہ اور حضرات قادریہ جیلانیہ سلوک کی ابتداء ذکر بالجہر سے کرتے ہیں اور اس میں ضربوں کا لگانا اور ضربوں کے لئے مخصوص مواضع کا تجویز کرنا اور اس کے لئے ایک مخصوص نشست اور ہیئت کو اختیار کرنا کیوں ہے اور یہ کہاں سے لیا گیا ہے۔؟

اس کے جواب میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ایک عبارت ان کے مشہور رسالہ قول الجمیل سے نقل کر دینا کافی ہے۔

فصل فی اشغال المشائخ الچشتیہ	یہ فصل مشائخ چشتیہ کے اشغال میں
وھم اصحاب امام الطریقۃ خواجہ	ہے جو کہ امام الطریقت خواجہ معین الدین چشتیؒ
معین الدین حسن الچشتي۔ وچشت	کے مریدین واصحاب ہیں اور چشت حضرت

قرية - شيوخه رضي الله عنه وعنهم
قالوا جاء عليٌّ الى النبي صلى الله عليه
وسلم فقال يا رسول الله دُلّني على
اقرب الطريق الى الله وافضلها
عند الله واسهلها لِعبادة فقال
رسول الله صلى الله عليه وسلم
عليك بملازمة الذكر في الخلوة
فقال علي كرم الله وجهه كيف اذكر
يا رسول الله فقال رسول الله
صلى الله عليه وسلم غمض عينيك
واسمع مني ثلث مرات فالنبي صلى
الله عليه وسلم قال لا اله الا
الله ثلث مرات وعلي يسمع ثم قال
علي كرم الله وجهه لا اله الا الله ثلث
مرات والنبي صلى الله عليه وسلم
يسمع ثم لقن علي كرم الله وجهه الحسن
البصريَّ وهكذا حتى وصل الينا و
هٰذا الحديث انما وجدناه عند
هؤلاء المشائخ وعلى قوانين اهل
الحديث فيه بحث طويل؟

خواجہ معین الدین کے مشائخ کی بستی کا نام ہے
مشائخ چشت نے فرمایا کہ امام الاولیاء
علی مرتضیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے
اور کہا یا رسول اللہ مجھ کو اللہ کی طرف لے
جانے والی قریب ترین راہ بتلائیے جو اللہ کے
نزدیک سب سے افضل اور اس کے بندوں
کے نزدیک سب سے آسان ہو۔ آپ
نے فرمایا تم خلوت میں ذکر اللہ کو لازم کر کے
اس پر مداومت کرو۔ حضرت علی نے کیفیت
ذکر دریافت کی تو آپ نے فرمایا آنکھیں
بند کرو اور مجھ سے تین بار سنو پھر آپ نے تین مرتبہ
لا الہ الا اللہ فرمایا اور حضرت علی سنتے
تھے اس کے بعد حضرت علی نے تین مرتبہ اسی
طرح لا الہ الا اللہ اور آنحضرت سنتے
تھے، پھر علی مرتضیٰ نے حسن بصری کو اس کی
تعلیم دی۔ اسی طرح یہ طریقہ ذکر درجہ بدرجہ ہم
تک پہونچا ہے۔ اس حدیث کو ہم نے صرف
مشائخ چشتیہ کے پاس پایا ہے اور محدثین
کے قوانین کی رو سے اسمیں طویل بحث ہے

پھر حضرت شاہ صاحبؒ نے اس حدیث کو دو وجہ سے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔
اول، رکاکتِ الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے۔ دوم، یہ حدیث نہایت غریب اور منقطع ہے کیونکہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ثابت نہیں۔ درحقیقت یہ روایت منقطع ہے اور اس کا اتصال ثابت کرنا نہایت مشکل ہے لیکن اولیاء چشت رحمہم اللہ عنہم کے ساتھ حسن ظن کا تقاضہ ہے کہ اس حدیث کو شبۂ انقطاع کی وجہ سے پایہ اعتبار سے ساقط نہ کیا جائے کیونکہ امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک بشرط عدالت، حدیث مرسل کا راوی قابلِ حجت اور مقبول ہے۔

نیز حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ "فصل فی اشغال المشائخ الجیلانیۃ" میں فرماتے ہیں:

لعلك تقول ما الحكمة فی اشتراط الضربات والتشديد ومراعات اماكنها فاقول جبل الانسان علی التوجه الی الجهات والاصغاء الی ايقاع النغمات وان تدور فی نفسه الاحاديث والخطرات فوضعوا هذا الوضع سداً للتوجه الی غير نفسه وکبحاً عن خطور الخطرات ليتدرج منه الی قصر التوجه علی الله تعالیٰ

یعنی شاید تم کہو کہ ضربات اور ان میں شدت کرنے میں کیا حکمت ہے، ان کے لئے خاص مکانات تجویز کرنے میں کیا فائدہ ہے تو میں کہتا ہوں کہ انسان خلقی طور پر جہات مختلفہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور آوازوں کی طرف کان لگاتا ہے، اس کے دل میں مختلف قسم کی باتیں اور خیالات چکر کاٹتے ہیں اس لئے علمائے طریقت نے اپنی

ذاکر سے ہٹ کر دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونے اور طرح طرح کے خیالات آنے سے روکنے کے لئے یہ طریقہ نکالا ہے تاکہ آہستہ آہستہ اپنی ذات سے بھی توجہ ہٹ کر انسان کا دھیان پورے طور پر حق تعالیٰ کی طرف لگ جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کا منشا یہ ہے کہ انسان جبلی اور فطری طور پر جب مختلف چیزوں پر نظر ڈالتا ہے، رنگ برنگ کی اشیاء کو دیکھتا اور طرح طرح کی آوازیں سنتا ہے تو اس کے قلب کی توجہ ادھر اُدھر بٹ جاتی ہے اور جب ذاکر خلوت میں آنکھ بند کر کے زور زور سے ذکر میں مشغول ہوگا تو نہ کوئی چیز دکھائی دے گی اور نہ کوئی آواز کان میں پڑے گی اس لئے قلب کی توجہ ادھر اُدھر نہیں جائے گی اور تمام تر توجہ حضرت حق سبحانہٗ تعالیٰ کی طرف ہو جائے گی۔ اسی طرح ذکر کے وقت ذاکر کے لئے جو خاص نشستیں تجویز کی گئی ہیں ان کی بعض صورتوں میں کسر نفسی ہے اور بعض میں خشوع و خضوع اور بعض میں جمعیتِ خاطر اور دفع وسواس، اور بعض میں نشاط ہے۔ لہٰذا ایسے امور کو مخالف شرع یا بدعاتِ سیئہ میں داخل نہ سمجھنا چاہیئے۔

ذکر جلی و خفی کے سلسلہ میں ایک مقام پر حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

واعلم ان قلبك موضوع تحت ثديك الأيسر باصبعين على صورة زهر الصنوبر وله بابان، باب فوقاني وباب تحتاني اما الباب الفوقاني ففتحه بالذكر الجلي، واما التحتاني ففتحه بالذكر الخفي۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ تیرا دل بائیں چھاتی کے دو انگل برابر نیچے شگوفہ چلغوزہ کی صورت میں ہے۔ اور اس کے دو دروازہ ہیں، ایک اوپر کا، اور دوسرا نیچے کا، اوپر کا دروازہ ذکر جلی سے کھلتا ہے اور نیچے کا ذکر خفی سے۔

شاہ صاحبؒ نے حاشیہ پر فرمایا ہے کہ باب فوقانی سے مراد دل کا وہ حصہ ہے جو جسم سے متصل ہے اور باب تحتانی سے مراد وہ حصہ ہے جو روح سے متصل ہے۔

مشائخ نقشبندیہؒ کے اشغال واذکار

حضرات نقشبندیہ مجددیہ رحمۃ اللہ علیہم سلوک کی ابتداء ذکر خفی اور ذکر قلبی سے کرتے ہیں۔

طریقہ ذکر اسم ذات بائیں ہاتھ کی طرف سینہ سے دو انگشت نیچے پسلی کی طرف دل ہوتا ہے۔ لہٰذا اپنے قلب کی خیالی زبان سے ہر وقت چلتے پھرتے، بات چیت کرتے، کھاتے پیتے، لکھتے پڑھتے اور ہر حالت میں پاک ہو یا ناپاک اللہ کہتا رہے اور پوری توجہ کے ساتھ دل سے خدا کو یاد کرے اور دل میں غیر خدا کو حتی الامکان نہ آنے دے، اگر آجائے تو اس کو فوراً دور کرے اور اس میں حق تعالیٰ کی صفات مثلاً سمیع و بصیر وغیرہ کی طرف نہیں بلکہ صرف خدا کی ذات مستجمع صفات بیچون و بیچگون کی طرف خیال رکھنا چاہیئے۔

طریقہ ذکر نفی و اثبات کلمہ لاالٰہ الا اللہ کے لا کو قوتِ خیال کے ذریعہ ناف سے اٹھا کر دماغ تک لیجائے اور اِلٰہ کو دماغ سے سیدھے مونڈھے پر لائے اور اِلا اللہ کو سیدھے مونڈھے پر سے قلب پر ضرب کرے اور اس ذکر کو حبس دم کے ساتھ کرے تو فائدہ جلد محسوس ہوگا۔ سانس بند کرکے ذکر کرنا امام الطریقہ حضرت خواجہ نقشبندؒ کے نزدیک صرف فوائد میں

داخل ہے، شرط نہیں ہے۔

طریقہ حبس دم سانس کو زیر ناف بند کر کے ایک سانس میں تین مرتبہ پھر پانچ مرتبہ پھر سات مرتبہ اور پھر نو مرتبہ، پھر گیارہ مرتبہ، اسی طرح تدوطاق کے ساتھ اکیس مرتبہ تک ذکر کرنے کا ملکہ پیدا کرے اس طرح سے اکیس مرتبہ ہوتے ہوتے کشود باطن ہونے لگتا ہے، اثناء ذکر میں خیال غیر خدا کو نہ آنے دے بعض بزرگ ایک سانس میں ذکر نفی و اثبات سَو سَو مرتبہ کر لیا کرتے ہیں اور ذکر اسم ذات تو کئی کئی سو بار کرتے ہیں۔

طریقہ ذکر اسم ذات جو لطائف ستہ سے متعلق ہے صوفیاء سابقین رحمہم اللہ تعالیٰ عنہم نے صرف دو لطیفوں یعنی قلب اور روح کی خبر دی ہے اور بعض نے لطیفہ سر کی بھی، لیکن حضرت مجدد الف ثانی رح نے قلب[۱]، روح[۲]، سر[۳]، خفی[۴] اور اخفی[۵]، پانچ لطیفے انسان میں قرار دیئے ہیں اور ہر لطیفہ کا مقام اور اس کا نور و رنگ تجویز کیا ہے یعنی جسم انسانی میں یہ وہ مقامات ہیں جو فیضان و برکات اور انوار الٰہی سے لبریز ہیں۔ بعض حضرات نے لطیفہ نفس کو بھی عالم امر سے قرار دے کر کل "لطائف ستہ" یعنی چھ لطیفے تسلیم کئے ہیں۔

تحقیق لطائف الا له الخلق والامر

پانچ لطائف عالم امر کے ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی اور اخفی ــــــ عالم امر کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کُن کے فرماتے ہی یہ سب اپنی اپنی جگہ پر قائم ہو گئے اور پانچ ہی لطیفے عالم خلق کے ہیں۔ آب، خاک، ہوا، آتش

اور سب کا لب لباب لطیفۂ نفس ہے اور لطائف عالم خلق یہ ہیں کہ یہ سب بتدریج پیدا ہوئے ہیں۔ درحقیقت عالم امر کے لطائف خمسہ کی اطلاع دینا حکماء الٰہی کا کام ہے۔ حکمائے یونان مثلاً افلاطون، جالینوس، ارسطو وغیرہ کی حکمت ہیں اور یورپ کے حکماء سائنس اور زمانۂ حال کی تحقیقات میں کہیں اس کا پتہ نہیں، اس میں نہ دوربین کام دیتی ہے اور نہ کوئی آلہ اور نہ علم مسمریزم کام دیتا ہے۔ حکمائے غیر مذاہب کو تو اپنے سینے کے حالات اور معاملات سے ابھی پوری آگاہی نہیں وہ آسمانوں کے حالات سے کیا واقف ہو سکتے ہیں اور ان کا کونسا بیان ماننے کے لائق ہو سکتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

چند چند حکمت یونانیاں ۔۔۔ حکمت ایمانیاں راہم بخواں

کہاں تک یونانی حکمت پڑھو گے ۔۔۔ ایمان والوں کی حکمت بھی پڑھو

مقاماتِ لطائف

لطیفۂ قلب کا مقام بائیں پستان کے نیچے ہے اور لطیفہ روح کا مقام لطیفہ قلب کے مقابل داہنے پستان کے نیچے ہے اور لطیفہ سر کا مقام بقدر دو انگشت بائیں پستان سے اوپر سینہ کی طرف مائل ہے اور لطیفۂ خفی کا مقام اسی اندازہ پر داہنے پستان کے اوپر وسط سینہ کی طرف مائل ہے اور لطیفہ اخفیٰ کا مقام سینہ کے درمیان ہے اور لطیفۂ نفس کا مقام پیشانی کے آغاز میں ہے جہاں اوروں کے نزدیک لطیفۂ خفی کا مقام ہے۔

سالک کو چاہیئے کہ پہلے لطائف ستہ کو ذکر سے جاری رکھے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ طالب مؤدب ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ باوضو بیٹھے اور زبان کو تالو سے لگا کر اور آنکھیں بند کر کے دل کی خیالی زبان سے اللہ اللہ کہے۔

اس طرح پر کہ اس اسم مبارک کو غیر ذات نہ سمجھے اور اسے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت اور ہر حالت میں جاری رکھے۔ اسی طرح چھٹوں لطیفوں کو بترتیب مذکور جاری کرے،
اور لا الٰہ الا اللہ کے ذکر سے لطائف ستہ کے جاری کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ لفظ لا کو ناف سے کھینچکر دماغ تک پہونچائے اور جن جن مقامات سے لا کا گذر ہوا ہے اور تمام چیزوں کی نفی متصور کرتا جائے اور الٰہ کو لطیفہ روح تک پہونچائے، اور الا اللہ کی قلب پر ضرب کر کے اللہ تعالیٰ کی ذات کا اثبات کرے۔

اس ذکر میں نفی و اثبات دونوں صرف خیال سے ہوں گے اور زبان سے ہرگز تلفظ نہ ہوگا۔

طریقہ ذکر سلطان الاذکار

لطائف ستہ کے ذکر اللہ سے جاری ہونے کے بعد تمام اجزاء جسم حتیٰ کہ ایک ایک رونگٹا ذکر اللہ کرنے لگے اور ذاکر اس کو محسوس کرے اس کو سلطان الاذکار کہتے ہیں کبھی کبھی اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ تمام بدن میں جنبش ظاہر ہو جاتی ہے اور کبھی رعشہ کی طرح حرکت ظاہر ہوتی ہے اور کبھی رونگٹے کھڑے ہونے کی سی حالت ظاہر ہو جاتی ہے، یا چیونٹیاں سی اس کے بدن پر چلنے لگتی ہیں اور تمام بدن میں خنکی اور سبکی معلوم ہونے لگتی ہے۔
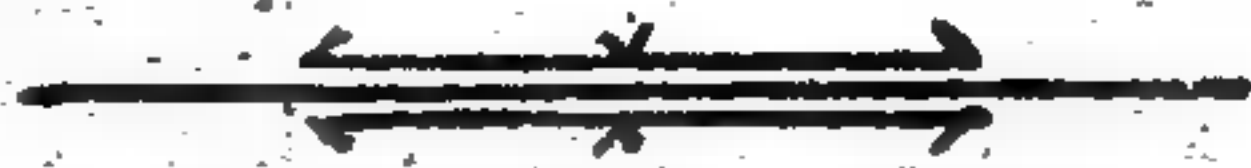
باب پنجم

مراقبات

شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو امور کی طرف خاص طور پر ترغیب اور تحریص دلائی ہے ذکر اور فکر۔

ذکر سے مراد حق تعالیٰ کو زبان سے یاد کرنا ہے اور فکر سے مراد مراقبہ ہے۔ سالک کو نور ذکر سے منوّر ہونے کے بعد مراقبہ کی طرف توجہ کرنا چاہیئے۔

ذکر جلی ہو، یا خفی، لسانی ہو، یا قلبی، ضربوں کے ساتھ ہو، یا پاس انفاس، حبس دم ہو یا ذکر عناداری جن کی تفصیل و تشریح بقدر ضرورت ماسبق میں بیان کی گئی ہے ان سب کا مقصد اور مآل یہی ہے کہ ذکر اللہ سالک کے تمام بدن کو عموماً اور اعضاء ذکر کو خصوصاً پورے طور پر احاطہ کرے اور بشریت کی ظلمت زائل ہو جائے۔ سالک فنا جسمانی کی تمہید بن کر، فکر، ذکر سے مختلط اور ذکر سے مراقبہ کی طرف منتقل ہو۔ اس وقت سالک کو فکر ذکر و مراقبہ میں مشغول ہونا چاہیئے۔

مراقبہ کی حقیقت مراقبہ کو سمجھنے کے لئے گھڑی کی بال کمانی پر غور کرنا چاہیئے کہ پہلے تو مختصر اور چھوٹی مگر گھڑی کے تمام پرزوں کی

حرکت اس کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح سوچنے اور مراقبہ کرنے سے دین کے قلعے فتح ہو جاتے ہیں۔ مراقبہ کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر سلسلہ میں جداگانہ آیاتِ قرآنی کے معانی و مفاہیم کا تصور کیا اور کرایا جاتا ہے۔ مراقبہ میں زیادہ تر ایسی آیات اختیار کی گئی ہیں جن میں خداوند تعالیٰ کی صفاتِ عظمت و قدرت کا بیان ہے تاکہ حق تعالیٰ کی عظمت و قدرت کی اہمیت دل میں اس قدر بڑھ جائے کہ دل اور دماغ ماسوی اللہ سے بالکل خالی ہو جائیں مثلاً اینما تولوا فثم وجه الله، الم یعلم بان الله یری، نحن اقرب الیه من حبل الورید، والله بکل شيء علیم، ان معی ربی سیهدین، هو الاول والاخر والظاهر والباطن۔ کل من علیها فان ویبقی وجه ربك ذو الجلال والاکرام، ان الموت الذی تفرون منه فانه ملاقیکم، اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدة۔

مراقبات مذکورہ کے علاوہ اگر طالب اپنے جسم بلکہ تمام عالم کو آبِ مصفٰی کا ایک دریا خیال کرے تو اس تصور میں توحید کے مسائل و معارف کا بدرجہ کمال انکشاف ہوگا اور ایک طرح کی اپنے اندر راحت و رغبت اور خنکی و صفائی اور نورانیت محسوس کرے گا۔

مراقبہ کا طریقہ مراقبہ کا طریقہ یہ ہے کہ دوزانو نمازی کی طرح سر جھکا کر بیٹھے اور دل کو غیر اللہ سے خالی کر کے حق تبارک و تعالیٰ کی حضوری میں حاضر رکھے اور اعوذ باللہ و بسم اللہ پڑھ کر تین بار " اللہ حاضری" " اللہ ناظری " " اللہ معی" کو زبان سے تکرار کر کے مراقب ہو اور ان کے معانی پر دل سے غور کرے اور تصور کرے کہ اللہ تعالیٰ حاضر و ناظر اور میرے پاس موجود ہے اس تصور میں اس قدر

مستغرق ہو کہ غیر حق کا شعور باقی نہ رہے، یہاں تک کہ اپنی بھی خبر نہ رہے۔

مراقبہ کی دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ نور السمٰوات والارض یعنی انوارِ الٰہیہ کو جو ہر زمان ومکان میں موجود ہیں، ملاحظہ کرے اور مستغرق ہو جائے، اسی طرح تمام مذکورہ آیات کے مضامین ومفاہیم میں غور وفکر اس درجہ کرے کہ پورے طور پر استغراق اور محویت ہو جائے۔
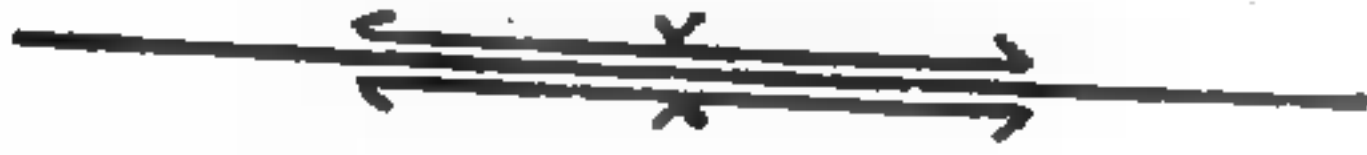
باب ششم

مذموم اخلاق سے اجتناب اور اسکا طریقہ

راہ حق کے سالکوں کا بخل، حسد، تکبر، غیبت، کینہ، ریا، کذب، طمع و حرص وغیرہ بد عادتوں اور بری خصلتوں سے آلودہ اور عادی ہونا، ان پر فیض رحمانی کے نزول اور عنایات ربانی کے ظہور سے بہت بڑا مانع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین رذائل اخلاق سے نفس کا تزکیہ نہایت ضروری سمجھ کر صرف رضاء الٰہی حاصل کرنے کے لئے ان کو اپنے قلب سے دور کرتے تھے، حتیٰ کہ ان کے قلوب پر ان رذائل کا مطلق اثر نہیں رہتا تھا۔ اور ان کے دل بالکل صاف و شفاف ہو جاتے تھے، اسی لئے یہ حضرات انعامات الٰہیہ سے مالا مال ہو کر مقبول بارگاہ الٰہی ہو جاتے تھے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص مراتب سلوک طے کرتے اور ذکر و شغل میں پیہم لگے رہنے کے باوجود عنایات ربانی کا مورد نہ بنے اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اسنے اپنے آپ کو رذائل اعمال سے پاک و صاف نہیں کیا ہے۔ لہٰذا نہایت ضروری ہے کہ طالب اپنے آپ کو رذائل اعمال اور منہیات شرعیہ سے محفوظ رکھے تاکہ انوار الٰہیہ اور تجلیات ربانی کا مورد بن سکے۔

ارشادِ خداوندی ہے کہ جس نے اپنا قلب پاک کیا وہی فلاح یاب ہوا۔

جنابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ طہارت نصف ایمان ہے۔ ایمان کے دو جز ہیں' ایک قلب کو ان نجاستوں سے پاک کرنا جو حق تعالیٰ کو ناپسند ہیں۔ دوسرے ان خوبیوں سے آراستہ کرنا جو حق تعالیٰ کو محبوب ہیں۔ گویا نجاست سے طہارت حاصل کرنا' ایمان کا ایک جز ہے اور اطاعت سے زینت و زیبائش دینا اس کا دوسرا جز ہے۔

اس باب میں ان اخلاقِ ذمیمہ کا بیان ہے جن سے قلب کو پاک رکھنا ضروری ہے اور اگلے باب میں ان اخلاقِ حمیدہ کا بیان ہوگا جن سے قلب کو مزین کرنا ضروری ہے۔

کثرتِ اکل

زیادہ کھانا بہت سے گناہوں کی جڑ ہے۔ اور قلتِ طعام میں بیشمار فوائد ہیں۔

۱۔ قلب میں صفائی اور بصیرت میں روشنی حاصل ہوتی ہے بخلاف اس کے زیادہ کھانے سے بلادت پیدا ہوتی ہے اور دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔

۲۔ دل رقیق اور نرم ہو جاتا ہے اور مناجات میں مزا آتا ہے۔ خوف و خشیت اور انکساری پیدا ہوتی ہے' نفسِ سرکش ذلیل اور مغلوب ہو جاتا ہے اور حق تعالیٰ کی طرف کامل توجہ ہو جاتی ہے۔

۳۔ بھوک کی وجہ سے آخرت کی مصیبتوں اور عذابِ الٰہی کی تکلیفوں کا احساس بخوبی ہو جاتا ہے اس لئے نافرمانی اور حکم عدولی کی جرأت نہیں ہوتی۔

۴۔ تمام شہوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور دنیا کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔

۵۔ نیند زیادہ نہیں آتی اور عبادت گراں نہیں گذرتی۔

۶۔ دنیاوی تفکرات کم ہوجاتے ہیں اور فکرِ معاش کا بار ہلکا ہوجاتا ہے۔

تنبیہ: یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تقلیل غذائی نفسہٖ مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود قوت بہیمیہ کا توڑنا ہے اور اس کا مقصد نفس کو گناہوں سے روکنا ہے اگر کسی شخص کو کف نفس عن المعاصی اس کے بغیر حاصل ہوجائے تو پھر تقلیل غذا سے اپنے آپ کو کمزور نہیں بنانا چاہیئے۔

فضول گوئی اور کثرت کلام

فضول گوئی اور بے ہودہ بکواس سے دل سیاہ ہوجاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنی شرم گاہ اور زبان کا کفیل ہوگیا، میں اس کے لئے جنت کا کفیل ہوں گا۔

حدیث میں ہے کہ زبان ہی کے باعث اکثر لوگوں کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالا جائیگا!

زبان کے گناہوں سے بچنے کے لئے اس آیۃ پر عمل ضروری ہے "لاخیر فی کثیر من نجواھم" زبان کی وجہ سے عموماً پانچ گناہ ہوتے ہیں۔ اور ان سے اجتناب ضروری ہے۔ جھوٹ بولنا۔ غیبت کرنا۔ فضول جھگڑا کرنا۔ مذاق اور دل لگی کرنا، ناجائز مدح اور تعریف کرنا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جھوٹ بولنا مسلمانوں کی نشان نہیں۔ ایمان اور جھوٹ ایک جگہ جمع نہیں ہوتے۔ جھوٹ بولنے سے قلب میں کجی آتی ہے اسی لئے مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولنا چاہیئے۔

غیبت کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا تم میں کوئی شخص پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ پس اس سے پرہیز کرو۔ حدیث میں ہے کہ گھاس پھونس میں آگ کے اثر کرنے سے کہیں زیادہ اور جلد غیبت آدمیوں کی نیکیوں میں اثر

کرتی ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ دوسرے کے عیب پر نظر کرنے کے بجائے اپنے عیوب پر
نظر ڈالے۔

فضول جھگڑے کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو مسلمان باوجود
حق پر ہونے کے جھگڑے سے دست بردار ہو جائے تو اس کے لئے جنت میں اعلیٰ محل تیار
ہو گا۔ کسی پر اعتراض کرنا، اس کی غلطی نکالنا یا اس کے لفظ یا معنی میں نقص نکالنا عام طور پر اس
لئے ہوتا ہے کہ آدمی اپنی بڑائی اور قابلیت ظاہر کرے۔ اور یہ دل کا بہت بڑا روگ ہے۔

مذاق اور دل لگی سے دل مردہ ہو جاتا ہے، ہیبت اور وقار جاتا رہتا ہے، نورِ معرفت
بجھ جاتا ہے۔ اگر قدرے مزاح کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ بیوی بچوں کا دل
خوش کرنے کے لئے مزاح مسنون ہے۔

بیجا مدح میں جھوٹ اور چاپلوسی ہے اور ممدوح یعنی جس کی تعریف کی جاتی ہے
اس کو متکبر اور مغرور بناتا ہے۔

غصہ آگ کا ایک شعلہ ہے جس کا بجھانا اور توڑنا نہایت ضروری ہے۔ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کسی شخص کے پچھاڑنے سے آدمی پہلوان نہیں ہوتا، بلکہ پہلوان
وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو پچھاڑے۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک
سب سے بہتر گھونٹ جو آدمی پیتا ہے اس کے غصہ کا گھونٹ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
سلم فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کو اپنے بیوی بچوں یا ایسے لوگوں پر غصہ آئے، جن پر وہ اپنا
غصہ چلا سکتا ہے اور سزا دے سکتا ہے مگر وہ غصہ کو ضبط کر جائے اور تحمل سے کام لے تو
حق تعالیٰ اس کا قلب امن و ایمان سے لبریز کر دے گا۔ پس تحمل کی بدولت مسلمان
شب بیدار، روزہ دار، عابد و زاہد کا مرتبہ پا لیتا ہے۔

حسد کرنا حرام ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے، میرے کسی بندے پر نعمت دیکھ کر حسد کرنے والا گویا میری تقسیم سے ناراض ہے جسے میں نے اپنے بندوں میں کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح جلا دیتا ہے جس طرح آگ سوکھی لکڑی کو جلاتی ہے۔ البتہ غبطہ جائز بلکہ بعض امور میں پسندیدہ ہے یعنی کسی کو اچھے حال میں دیکھ کر خود بھی اسی حال کی تمنا کرنا، بخل اور مال کی محبت نہایت مہلک مرض ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی نعمت میں بخل کرتے ہیں وہ اس کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں بلکہ یہ ان کی نہایت بدترین خصلت ہے کیونکہ لوگ اللہ کی دی ہوئی جس چیز میں بخل کریں گے اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں ڈال دیا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اپنے آپ کو بخل سے بچاؤ کیونکہ اس نے پہلی امتوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ پس مسلمان کو کسی طرح زیبا نہیں ہے کہ وہ بخل کرے اور جہنم میں جائے۔ بخل کا باعث عام طور پر حب مال ہے، اس لئے حب مال کو ترک کرنا نہایت ضروری ہے۔ بخل کا مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اور جس جگہ پر شریعت مال خرچ کرنے کا حکم دے یا مروت تقاضہ کرے، وہاں مال کا خرچ نہ کرے۔

رعونت محبت جاہ اور شہرت طلبی۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ دار آخرت کی خوبیاں ان ہی کے لئے مخصوص ہیں جو زمین پر رہ کر بڑھنا چڑھنا اور فتنہ و فساد کرنا نہیں چاہتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، بکریوں کے گلے میں دو بھیڑیئے آ جائیں تو وہ اتنا نقصان نہ کریں گے جتنا مال و جاہ کی محبت دیندار مسلمان کا نقصان کرتی ہے۔ رعونت اور حب جاہ نہایت بُری بلا ہے۔ اس سے قلب میں نفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ درحقیقت وہ لوگ نہایت آرام میں ہیں جن کو کوئی جانتا بھی نہیں جو پریشان حال غبار آلود ہوتے ہیں۔

لوگ ان کو اپنے پاس بٹھانا پسند نہیں کرتے اور نہ ان کو اپنی کوٹھی، بنگلوں میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں اگر وہ نکاح کرنا چاہیں تو کوئی ان کو لڑکی دینا پسند نہیں کرتا، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے اور ذلت و مسکنت کی حالت میں پڑے رہتے ہیں، ان ہی میں ایسے بندے بھی ہوتے ہیں کہ اگر کسی بات پر قسم کھا بیٹھیں تو حق تعالیٰ ان کی خاطر ان کی قسم کو پورا فرما دیتا ہے۔

یاد رکھو کہ جہاں آدمی کی شہرت ہوئی اور اس کو مسند عزت پر بیٹھنا اور لوگوں کے آگے آگے چلنا پسند آیا تو بس اس کے حق میں تباہی آگئی۔

خدا کے مخصوص بندے اپنے آپ کو بہت زیادہ چھپاتے ہیں، البتہ بلا طلب اور بغیر خواہش کے اگر حق تعالیٰ ہی ان کو ظاہر فرما دے تو پھر ان کو اپنے آپ کو چھپانا مناسب نہیں رہتا۔ انبیاء علیہم السلام، خلفاء راشدین اور اولیاء اللہ رحمہم اللہ علیہم اجمعین کی دنیا میں شہرت ہوئی مگر چونکہ ان میں سے کسی نے بھی اپنی شہرت کی آرزو یا خواہش نہیں کی بلکہ ان کے پیش نظر محض حق تعالیٰ کی عبادت و اطاعت تھی اس لئے اس نے جس حالت میں رکھا اس پر راضی ہو گئے۔ حب جاہ یہ ہے کہ آدمی خود جاہ و منصب کی خواہش کرے۔ ظاہر ہے کہ اس سے رعونت پیدا ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔

حب جاہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرنا چاہے اور خواہش کرے کہ لوگوں کے دل میرے مطیع ہو جائیں لوگ میری تعریف کیا کریں، میری حاجت کے پورا کرنے میں پیش پیش رہیں۔ مال کے ساتھ بھی آدمی کو اسی غرض سے محبت ہوتی ہے کہ وہ رفع حاجت کا ذریعہ ہے اور جاہ و شہرت کی خواہش بھی اسی لئے ہوتی ہے کہ کوئی ضرورت بند نہ رہے۔

لہٰذا نتیجہ اور مقصود کے اعتبار سے اگرچہ دونوں کی غرض وغایت ایک ہی ہے۔ مگر حب جاہ کی حیثیت حب مال سے کہیں زیادہ ہے اس لئے کہ حب جاہ سے مال بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اس کو کوئی چرا بھی نہیں سکتا اور نہ کوئی لوٹ سکتا ہے۔ بخلاف مال کے کہ بسا اوقات اس سے جاہ حاصل نہیں ہوتا اور اس میں چوری ہونے اور لٹ جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ دستور ہے کہ جب کسی شخص کی تعظیم اور توقیر کا اعتقاد عام لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے، تو لامحالہ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس بارے میں اپنا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں اور بلکہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ پس اس طرح حب جاہ میں بلا تکلف اور بلا مشقت کامیابی ہو جاتی ہے۔ بخلاف حصول مال کے کہ بسا اوقات حسب منشاء مال کے جمع ہونے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس کے لئے بیسیوں تدبیریں اور حیلے کرنے پڑتے ہیں، پھر بھی کامیابی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو مال کی بہ نسبت جاہ کی محبت اور خواہش زیادہ ہوتی ہے یہاں تک کہ فقرا بھی حب جاہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حب جاہ پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عموماً ہر آدمی کو اپنی بڑائی اور عزت کی بالطبع خواہش ہوا کرتی ہے۔ حالانکہ یہ عزت و شان اور یکتائی سوائے ذات واجب الوجود کے اور کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ تمام مخلوق اسی کی محتاج ہے۔ جو بندہ حب جاہ کی بلا میں مبتلا ہوتا ہے وہ گویا حق تعالیٰ کا مقابل ہونا چاہتا ہے اور اس ذات خداوندی کے ساتھ اپنی اس نسبت سے نازاں ہے جو دھوپ کے آفتاب کے ساتھ ہوتی ہے، گویا اس کا نفس فرعون کی طرح انا ربکم الاعلیٰ پکار رہا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ فرعون نے یہ کلمہ زبان سے لوگوں کے سامنے کہدیا تھا اور حب جاہ کے متوالے اس کو اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ چونکہ معلوم ہے کہ شان یکتائی کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ

ناممکن اور محال ہے۔ اس لئے آدمی چاہتا ہے کہ اگر مستقل وجود میں کامیابی نہ ہو تو کم از کم مخلوق پر قبضہ ہی ہو جائے اور جس چیز پر جو تصرف چاہوں کر سکوں۔ پھر چونکہ آسمان، چاند، سورج، پہاڑ، سمندر اور دوسری بڑی مخلوقات پر قبضہ دشوار نظر آتا ہے تو آسمان سے نیچے اتر کر متمنی ہوتا ہے کہ صرف زمین ہی کی مخلوق پر ایسے مالکانہ تصرف حاصل ہو جائے یعنی حیوانات، معدنیات، نباتات وغیرہ ہی میرے تابع اور فرماں بردار بن جائیں اور جن علویات آسمانی اور مخلوقاتِ ارضی پر مالکانہ تصرف ناممکن ہے ان سے پوری واقفیت حاصل ہو جائے تاکہ ہاتھ کا قبضہ نہ ہو تو علم ہی کا قبضہ رہے اور دنیا کی ذوی العقول مخلوق یعنی انسان قلبی اعتبار سے میرے مطیع اور فرماں بردار بن جائے اور میری عظمت کی معتقد ہو کر مجھ کو صاحب کمال سمجھنے لگے اور میری شہرت ان ملکوں تک پہونچ جائے جہاں میں خود نہیں پہونچ سکتا۔ ہر انسان ایک نہ ایک دن مرنے والا ہے اور اس کے بعد اس کی جاہ و شہرت ختم ہو جائے گی لہٰذا اگر یہ ناپائیدار شہرت و جاہ حاصل بھی ہو گئی اور مخلوق میں چند روزہ عزت اور وقعت مل بھی جائے گی تو کیا ہوا یہ کوئی خوبی اور کمال نہیں ہے، کمال تو ایسی چیز کا حاصل کرنا ہے جس میں موت خلل نہ پیدا کر سکے اور مرنے کے بعد بھی وہ باقی رہے، یہ مقام معرفتِ الٰہی کو حاصل ہے کہ صاحب معرفت کے دنیا سے انتقال کرنے پر بھی معرفت کے بے شمار مراتب میں اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ لہٰذا رعونت اور طلب شہرت کو دل سے نکال کر اس کی جگہ معرفت الٰہی کا نور حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر تمام دنیا تم کو سجدہ بھی کرنے لگے تو کتنے دن کے لئے ــــــ؟ آخر ایک دن نہ تم باقی رہو گے اور نہ تم کو سجدہ کرنے والے باقی رہیں گے! تعجب ہے کہ زمانہ تو تمہارے ساتھ اس قدر بخل کرتا ہے کہ شہر اور قصبہ تو درکنار تمہارا اپنے محلہ پر بھی پورا

قبضہ اور تسلط نہیں، پھر بھی تم زمانہ کی رنگینی میں ایسے ڈوبے ہو کہ دائمی نعمت اور جاوید سلطنت سے محرومی پر راضی ہو کر دنیا کی حقیر شہرت اور چند احمق اور نادان لوگوں کی تعظیم و تکریم پر نازاں ہو گئے جن کو نہ کسی کی موت نہ حیات کا اختیار ہے اور نہ کسی کے نفع و ضرر پر دسترس ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تم اس پائیدار عزت اور عالم ملکوت کی شہرت کو کھو بیٹھے جو حق تعالیٰ کی جناب اور اس کے فرشتوں میں تم کو حاصل ہو سکتی تھی، یہ ضرور ہے کہ مال کی طرح آدمی بقدر ضرورت جاہ کا بھی حاجت مند ہے تاکہ اس کی وجہ سے مخلوق کے ظلم و تعدی سے محفوظ اور ظالم حاکموں کے دستبرد سے بے خوف ہو کر باطمینان قلب عبادت میں مشغول رہ سکے لہٰذا اس قدر طلب جاہ میں مضائقہ نہیں لیکن اسکے ساتھ ساتھ اس امر کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ اتنی جاہ بھی اپنی عبادتوں میں مکر و ریا کر کے نہ حاصل کی جائے کیونکہ ریا حرام ہے نیز اپنے آپ کو متقی اور صوفی بنا کر مخلوق کو دھوکہ نہ دیا جائے اس لئے کہ درویشانہ یا عالمانہ صورت بنا کر مخلوق میں عزت حاصل کروگے تو خدا کے نزدیک مکار ٹھہروگے۔ بہر حال طلب جاہ نہایت خطرناک چیز ہے۔ اس کی ہوس انسان کو ایک حالت پر قناعت نہیں کرنے دیتی۔ حق بات تو یہ ہے کہ دین انہی لوگوں کا محفوظ ہے جن کا حال مخفی ہے اور ان کو کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس مرتبہ کے ہیں۔

حب مدح کا مرض

ہر شخص کے دل میں اپنی تعریف کی خواہش ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں لذت ملتی ہے اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

اول چونکہ ہر شخص کو مرغوب ہے کہ کمال (جو حق تعالیٰ کی صفت ہے) میرے اندر بھی پیدا ہو اس لئے اس کا نفس اپنی تعریف سے نہایت خوش ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ تعریف کرنے والا میرے کمال سے واقف ہے۔

دوم۔ ہر شخص کو تسخیر کی خواہش ہوتی ہے اور وہ اپنی مدح سنکر سمجھتا ہے کہ مداح کے قلب پر میرا قبضہ اور اثر ہوگیا ہے لہٰذا اس کو لذت ملتی ہے۔

سوم۔ آدمی مدح کو اپنی شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ لوگوں کو میری تعریف کی طرف توجہ ہوگئی ہے اب آہستہ آہستہ دنیا بھر میں شہرت پھیل جائے گی اس لئے اپنی مدح سے آدمی کا نفس پھولتا ہے۔

حبِ مدح کا علاج

اپنی طبیعت سے حبِ جاہ کو دور کرنے کا بہترین علاج یہ ہے کہ غور و فکر کرے اور سوچے کہ اگر کوئی شخص مال و عزت کی تعریف کرتا ہے تو یہ تعریف معرفت الٰہی کے حقیقی مال کے مقابلہ میں قابلِ مسرت نہیں ہے۔

دوم۔ اگر کوئی شخص تمہارے زہد تقویٰ کی تعریف کرتا ہے تو سوچو کہ یہ تعریف سچی ہو رہی ہے یا جھوٹی۔ اگر سچی ہے تو خیال کرو کہ حق تعالیٰ نے اس کو قبول بھی فرمایا ہے یا نہیں کیونکہ لوگوں کے اظہار کو قبولیت اور قربِ الٰہی میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔ اور اگر تعریف جھوٹی ہے تو خوش ہونا صریح حماقت ہے۔

حبِ دنیا کی حقیقت

دنیا کے تمام جھگڑوں، بکھیڑوں اور مخلوقات کے ساتھ دلی تعلق رکھنے کا نام دنیا کی محبت ہے

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے دنیا کی تمام چیزوں کو زمین کی زینت کا سامان بنایا ہے تاکہ لوگوں کو آزمائیں کہ کون ان پر فریفتہ ہو کر اپنی آخرت کو ضائع کرتا ہے اور کون بقدر ضرورت اس سے اپنے سفر کا توشہ لیکر اپنی آخرت کو سنوارتا ہے۔

ہوائے نفس کا مطلب

۱۔ زمین کی محبت، مثلاً مکان بنانا یا کھیتی باڑی کرنا
۲۔ نباتات کی محبت مثلاً جڑی بوٹی کو دوامیں ڈ

دیگر پیداوار مثلاً ترکاری، پھل، پھول کو کھانے میں استعمال کرنا۔

۳۔ معدنیات کی محبت: مثلاً برتن، اوزار، اور زیور بنا کر استعمال کرنا یا نقد جمع کرنا۔

۴۔ حیوانات کی محبت: مثلاً شکار کرنا، سواری کرنا، اور اپنی زینت بڑھانا۔

۵۔ آدمیوں کی محبت: مثلاً عورتوں کو اپنے نکاح میں لانا، خادمہ اور لونڈی بنانا اور مردوں کو اپنا خدمت گار اور نوکر بنانا، انھیں چیزوں کی محبت کا نام ہوائے نفس ہے جس کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو خواہش سے روک لیا اس کا ٹھکانہ جنت ہے۔ درحقیقت یہ جسم خاکی سفر آخرت کی سواری ہے اور چونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور منزل کا پڑاؤ ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اپنی سواری کے لئے چارہ گھاس اس کھیتی سے بقدر ضرورت و کفائت اٹھایا جائے اور سفر میں کام آنے والا سامان مہیا کرے وہ بیج بوؤ جس کو آخرت میں کاٹو اور پھر دائمی زندگی آرام سے گذارو۔

مسافرانِ آخرت کی تمثیل اور تقسیم

دنیا کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے ایک کشتی پر کچھ آدمی سوار ہوں اور کشتی کسی جزیرے کے کنارے پر آٹھہرے اور ملاح سواریوں کو اجازت دیدے کہ جاؤ جزیرے میں اتر کر اپنی ضرورتیں پوری کر آؤ۔ مگر ہوشیاری سے کام لینا جگہ خطرناک ہے اور ابھی دور دراز کا سفر سر پر ہے۔ غرض سواریاں اتریں اور ادھر ادھر منتشر ہو کر مختلف جماعتوں میں تقسیم ہوگئیں۔

اول درجہ:۔ بعض لوگ تو اپنی حاجتوں سے فارغ ہوتے ہی لوٹ پڑے اور فضول وقت گذارنا ان کو اچھا معلوم نہ ہوا، آئے تو دیکھا کہ کشتی خالی پڑی ہے لہٰذا

اپنی پسند کے مطابق ساری کشتی میں اعلیٰ درجہ کی ہوادار اور فراخ جگہ منتخب کرکے بیٹھ گئے۔

دوم درجہ: بعض لوگ جزیرہ کی خوش گوار ہوائیں کھانے، خوش الحان پرندوں کی ہر طرف آوازیں سننے اور سبز مخملی فرش پر رنگ برنگ کے پھول پتوں، درختوں اور پتھروں کی گلکاریوں کے دیکھنے میں مشغول ہو گئے مگر جلد ہی ہوش میں آکر کشتی کی جانب واپس ہوئے، آکر دیکھا کہ اچھی اور عمدہ جگہ خالی نہیں ہے کچھ تنگ جگہ رہ گئی ہے۔ لہٰذا تکلیف کے ساتھ اسی جگہ بیٹھ گئے۔

سوم درجہ: بعض لوگوں کو جزیرہ کی عارضی بہار پر اتنی فریفتگی ہو گئی کہ دریا کی رعنائیوں اور پتھروں کی خوش نمائیوں کے چھوڑنے کو ان کا دل نہ چاہا اور کافی دیر کے بعد اپنا بوجھ اپنی کمر پر رکھا اور سمندر کے کنارے پہنچے تو دیکھا کہ کشتی میں نہ بیٹھنے کی جگہ ہے اور نہ اس بوجھ کے رکھنے کی گنجائش ہے۔ بوجھ پھینکنے کو نفس گوارا نہیں کرتا بیٹھنے کو جگہ نہیں ملتی، غرض نہایت دقت کے ساتھ بوجھ سر پر لئے ہوئے ایک نہایت تنگ جگہ میں گھس کر بیٹھے۔ اندازہ کرو کہ ان کا وقت کس مصیبت اور تکلیف سے گزرے گا۔

چہارم درجہ: بعض لوگ جزیرہ کے دل افروز حسن پر ایسے عاشق ہوئے کہ کشتی اور سمندر سب کو بھول گئے کچھ خبر نہ رہی کہ کہاں جانا ہے؟ اور یہاں رہ کر کن موذی درندوں اور جانوروں کی غذا بننا ہے مگر جب سب کے بعد با دل ناخواستہ ساحل پر پہنچے تو کشتی میں نام کو بھی جگہ نہ تھی، تھوڑی دیر بعد کشتی لنگر اٹھا کر چل دی اور یہ لوگ کنارے پر کھڑے حسرت بھری نظروں سے اپنے ہمراہیوں کو دیکھتے رہ گئے۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوا کہ جزیرہ کے درندوں اور موذی جانوروں نے ان کے نازک اور خوب صورت بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے بعینہ یہی حال دنیا داروں کا ہے۔ اب غور کرو اور سمجھو کہ کن لوگوں پر کونسی مثال چسپاں ہوتی ہے۔

حُبِّ دنیا اور حُبِّ خدا ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں!

اپنے نفس کی ماہیت دنیائے دنی کی حقیقت اور خدا کی معرفت معلوم کر لینے کے بعد یہ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے کہ حق تعالیٰ کی محبت کے بغیر یعنی آخرت کی جاودانی نعمتیں ہرگز نہیں مل سکتیں اور حق تعالیٰ کی محبت کے ساتھ دنیا کی محبت کا جمع ہونا ایسا ہی ناممکن ہے جس طرح ایک برتن میں آگ اور پانی کا جمع ہونا ممکن ہے۔ اس لئے انسان کو بقدر ضرورت دنیا پر قناعت کر کے ہر لحظہ ذکر الٰہی میں مشغول ہونا چاہیئے تاکہ حق تعالیٰ کی محبت پیدا ہو۔

دنیا کی صحیح حقیقت کوڑی پر نظر آتی ہے

دنیا کو مقصود اصلی سمجھ کر اس کے کمانے والے ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ ان کی طلب و فکر کبھی ختم نہیں ہوتی، اور دنیا کا رنج و غم کبھی دفع نہیں ہوتا۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور ایک کوڑی پر لا کر کھڑا کر دیا، جہاں مُردوں کی کھوپڑیاں، نجاست و غلاظت کے ڈھیر، بوسیدہ ہڈیاں اور پھٹے پرانے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ پھر فرمایا دیکھو ابوہریرہ! یہ ہے دنیا کی حقیقت، ایک وقت وہ تھا کہ ان کھوپڑیوں میں بھی تمہاری طرح امیدیں اور آرزوئیں جوش مارتی تھیں۔ اور یہ حرص و ہوس سے لبریز تھیں، مگر آج کس بُرے حال کوڑی پر پڑی ہیں۔ چند روز میں یہ خاک ہو جائیں گی اور ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اور دیکھو یہ غلاظت اور فضلہ جو تمہیں نظر آرہا ہے یہ وہی غذا ہے، جس کو پیٹ کے اندر بھرنے میں حلال و حرام کا بھی امتیاز نہیں ہوتا۔ ایک دن تھا کہ یہی رنگ برنگ کے کھانے ہیں کہ تمہارے پیٹ میں تھا اور آج یہاں کوڑی پر کیسی گندی

حالت میں پڑا ہوا ہے، اس کی بُو سے بھی لوگ بھاگتے اور گھن کرتے ہیں۔ دیکھو یہ ہڈیاں کسی دن تمھاری سواری کے جانور اور مویشی تھے جن پر لوگ جانیں دیتے اور قتل و قتال کیا کرتے تھے، دیکھو یہ پھٹے پرانے چیتھڑے کسی وقت تمھارے چمک دمک والے لباس تھے، اور آج ہوائیں ان کو ادھر سے اُدھر اُڑائے پھرتی ہیں ان کا کوئی پُرسان حال نہیں۔

اے ابوہریرہ! یہ دنیا کی حقیقت ہے جس کا قابل عبرت ناک انجام دنیا ہی میں ظاہر ہو گیا ہے پس جس کو رونا ہو وہ رولے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایک دن دنیا کی حقیقت منکشف ہوئی۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک بدصورت بڑھیا بناؤ سنگار کیے ہوئے زیور و پوشاک پہن کر بیٹھی ہے، آپ نے پوچھا کہ اے بڑھیا تو کتنے مردوں سے نکاح کر چکی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بے شمار لوگوں سے۔! آپ نے فرمایا کہ ان شوہروں کا انتقال ہو گیا یا وہ تجھ کو طلاق دے بیٹھے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ طلاق دینے کی ہمت تو کس کو ہوتی ہے، میں نے ہی سب کو مار ڈالا۔ یہ سُن کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تیرے موجودہ شوہروں پر افسوس ہے کہ ان کو گزشتہ شوہروں کی حالت پر عبرت نہیں ہوتی۔ لہٰذا تم سمجھ لو کہ دنیا بڑی بے وفا ہے اس سے بچو اور آخرت کی فکر کرو۔

دنیا حق تعالیٰ کی میزبانی کی جگہ ہے

دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مہمان نواز نے اپنا مکان آراستہ کیا اور رنگ برنگ کے آئینوں، شیشوں اور آلات سے سجا کر مہمانوں کو بلایا اور ان کو اس میں بٹھا کر عطر، خوشبو اور پھولوں سے بھرا ہوا طبق ان کے سامنے رکھ دیا۔ صاحب مکان کا مطلب یہ تھا کہ لوگ طبق میں رکھے ہوئے پھولوں کو سونگھیں اور پاس والوں کے

آگے کر دیں تاکہ وہ اس سے اسی طرح نفع اٹھائیں اور پھر وہ بھی بطیب خاطر اپنے پاس والوں کے سامنے کر دیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لوگ پورے طبق پر قبضہ کر بیٹھیں اب اگر کوئی شخص آدابِ مجلس سے واقف نہ ہو اور طبق کو اپنا سمجھ کر اپنی بغل میں دبالے تو اس کی حماقت پر تمام حاضرینِ مجلس ہنسیں گے اور اس کا مذاق اڑائیں گے تجربہ ہو گا کہ مالک مکان زبردستی اس طبق کو چھین کر دوسروں کے سامنے رکھ دے گا۔ اب سوچو کہ جس وقت وہ اس کو چھین کر دوسروں کے سامنے رکھ دے گا تو طبق اٹھالے والے کو کس قدر ندامت ہو گی، اسی طرح دنیا حق تعالیٰ کی میزبانی کی جگہ ہے۔ اس سے حق تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ مسافرانِ آخرت آئیں اور بقدر ضرورت اس طرح نفع اٹھائیں جس طرح مستعار چیزوں سے نفع اٹھا کر اپنی حاجتیں پوری کیا کرتے ہیں۔ اس کے بعد خوشی کے ساتھ اسکو دوسروں کے حوالے کر کے اپنی آخرت کا راستہ لیں۔ مستعار چیزوں سے دل لگانا حقیقت میں چلتے وقت اپنے آپ کو شرمندہ اور رنجیدہ کرنا ہے۔

کبر کی حقیقت

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ تکبر کرنے والوں کا بہت برا ٹھکانا ہے۔ کبریائی خاص میری چادر ہے۔ پس جو شخص اس میں شریک ہونا چاہے گا میں اسکو ختم کر دوں گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس کے قلب میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ تکبر کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو صفاتِ کمالیہ میں دوسروں سے زیادہ سمجھے۔

آثارِ تکبر: ۱۔ راستہ چلتے وقت دوسروں سے آگے قدم رکھنا۔

۲۔ مجلس میں صدر مقام یا عزت کی جگہ بیٹھنا۔

۳۔ دوسروں کو حقارت سے دیکھنا۔

تکبر خیانتوں کا مجموعہ ہے ا۔ چونکہ کبریائی حق تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ اس لئے اس صفتِ کمالیہ میں جو شخص بھی شراکت چاہتا ہے اور منازعت کرتا ہے، وہ پہلے درجہ کا احمق اور خبیث النفس سمجھا جائے گا۔

۲۔ تکبر کی وجہ سے حق بات کے انکار کی نوبت آتی ہے جس سے دینی سعادت کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور متکبر خدا کی مخلوق کو حقارت سے دیکھنے لگتا ہے جو حق تعالیٰ کو بہت زیادہ ناپسند ہے۔

۳۔ تکبر نفس کو کوئی پسندیدہ صفت حاصل نہیں کرنے دیتا۔ (ا) تکبر کرنے والا تواضع سے محروم رہتا ہے (ب) حسد اور غصہ کے دور کرنے پر قادر نہیں رہتا۔ (ج) ریاکاری کا ترک اور نرمی کا برتاؤ اس کے لئے دشوار ہوتا ہے (د) کسی بھائی کی خیر خواہی اس سے ہو نہیں سکتی۔ (ہ) اپنی عظمت اور بڑائی کے غرہ میں مست اور تمام صفات سے موصوف ہونے کے خیال باطل میں ناصح کی نصیحت سے مستغنی اور نفس امارہ کی اصلاح سے محروم رہتا ہے۔ اس لئے تکبر جہنم میں جانے کا پورا سامان ہے۔ نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

تکبر کا علاج عموماً انسان کو چار باتوں کی وجہ سے تکبر ہوتا ہے۔ علم[۱]، تقویٰ[۲]، حسب[۳] و نسب۔ اور مال[۴] و جمال، ان میں سے ہر ایک کا علاج علیٰحدہ علیٰحدہ ہے۔

علم کا تکبر: چونکہ علم کے برابر کسی چیز کی فضیلت نہیں ہے، لہٰذا اس کو حاصل کرکے دو قسم کے خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہمارے برابر اللہ تعالیٰ کے یہاں دوسروں کا مرتبہ نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ لوگوں پر ہماری تعظیم ضروری ہے اگر لوگ تواضع سے پیش نہ آئیں تو تعجب ہوتا ہے۔ حالانکہ حق تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر کو یہ حکم فرمایا ہے کہ

اپنے متبع مسلمانوں کے ساتھ تواضع سے پیش آؤ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ بھی پیدا ہوں گے، جو قرآن پڑھیں گے مگر وہ ان کی زبانوں ہی پر رہے گا نہ حلق سے اترے اور نہ قلب تک اس کا اثر پہونچے گا۔ لوگوں سے کہیں گے کہ ہم قاری ہیں، ہم عالم ہیں، ہمارے برابر دوسرا نہیں مگر سُن لو، یہ لوگ دوزخ کا ایندھن ہوں گے۔

ایک مرتبہ حضرت حذیفہ رضی نماز کی امامت کر رہے تھے، سلام پھیر کر کہنے لگے کہ صاحبو! اپنے لئے کوئی دوسرا امام تلاش کر لو یا علیحدہ علیحدہ نماز پڑھ لیا کرو، میں امامت کے لائق نہیں ہوں، کیونکہ اس وقت میرے نفس میں یہ خیال آیا ہے کہ میرے برابر پوری جماعت میں کوئی شخص نہیں ہے اس لئے مجھ کو امام تجویز کیا گیا ہے۔

یاد رکھو کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو، یہ ضروری نہیں کہ اس کا خاتمہ بخیر ہی ہو جائے، اور کیسا ہی جاہل کیوں نہ ہو، یہ یقین نہیں کہ اس کا انجام بخیر نہ ہو۔ اس قسم کے واقعات اور احادیث میں غور کرنے سے تکبر جاتا رہے گا۔

دوسرا سبب تقویٰ و زہد

دیکھا جاتا ہے کہ عابد بھی اکثر تکبر کرنے لگتا ہے۔ بعض تو لوگوں کو ایذا پہونچانا اپنی کرامت سمجھتے ہیں، مثلاً اگر کسی شخص سے ان کو ایذا پہونچے تو جھلا کر لوگوں سے کہتے ہیں کہ ذرا دیکھتے رہو اللہ تعالیٰ اس کو کیسی سزا دیتا ہے اس نے ہم پر ظلم کیا ہے۔ عنقریب سزا بھی ایسی ملے گی کہ یاد رکھے گا۔ اس کے بعد اگر تقدیر سے وہ شخص بیمار پڑ گیا، یا مر گیا تو اس واقعہ کو اپنے دعویٰ کے ثبوت میں پیش کرتے اور خوش ہو کر کہتے ہیں کہ دیکھا اللہ کے فقیروں کو ایذا پہونچانے کا کیا نتیجہ پایا۔ ان احمقوں سے کوئی پوچھے کہ کافروں نے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو ہزارہا ایذائیں پہونچائیں مگر

کسی نے بھی انتقام کی فکر نہیں کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایذا دینے والے کفار نے مشرف بایمان ہو کر دنیا و آخرت کی بہبودی سے دامنوں کو بھر لیا۔ کوئی عابد اور ولی، کیا کسی نبی سے بڑھ کر ہو سکتا ہے؟ استغفر اللہ۔ عابد کو تو ہر شخص کے سامنے تواضع کرنا چاہیئے مثلاً اگر کسی گنہ گار عالم کو دیکھے تو اس کے سامنے علم کی وجہ سے جھک جائے۔ اس کے گناہ کا خیال نہ کرے کہ علم کی بڑی فضیلت اور عظمت ہے اور اگر جاہل فاسق کو دیکھے تو یوں سمجھے کہ کیا خبر شاید اس کی باطنی حالت مجھ سے بہتر ہو۔ پس دو چار ظاہر اعمال پر نازاں ہرگز نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ان عبادتوں میں ریا کا احتمال جدا ہے اور انجام و خاتمہ کا خطرہ الگ ہے۔

تیسرا سبب نسب ہے

بعض لوگ اپنے آپ کو شریف و عالی خاندان سمجھ کر تکبر کرتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے نسب میں غور کرو کہ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہر شخص کا نسب اس کے باپ کا ناپاک نطفہ اور ذلیل منی ہی ہوتا ہے۔ پس دوسروں کی خوبیوں پر ناز کرنا بڑی فاش قسم کی غلطی ہے۔ قابلِ فخر کام کرے کوئی اور ناز کرے کوئی۔ لہٰذا ہر شخص کو اپنے افعال کی فکر ہونی چاہیئے نہ کہ نسب کا فخر، کیونکہ نسب مدارِ نجات نہیں ہے۔

چوتھا سبب مال و جمال

آدمی اپنے مالدار ہونے یا حسین ہونے پر فخر کرتا ہے حالانکہ ان چیزوں پر بھی تکبر کرنا حماقت ہے۔ بھلا مال جیسی ناپائیدار چیز قابل فخر کیسے ہو سکتی ہے، جو چوری اور ڈاکہ سے سب کھو جاتی ہے، اسی طرح جمال جیسی عارضی چیز قابلِ فخر نہیں ہے کہ مہینہ بھر کے بخار سے سارا حُسن و جمال خاک میں مل جاتا ہے۔ یہ وقتی عوارض بھلا فخر و تکبر کے قابل کس طرح ہو سکتے ہیں؟

خود پسندی

خود پسندی کی مذمت میں حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اپنے نفس کو پاک صاف اور اچھا سمجھکر شیخی نہ مارو، یہ کافروں کا حال ہے کہ اپنے اعمال اور اپنے آپ کو اچھا سمجھیں۔ حدیث میں آیا ہے کہ خود پسندی تباہ کر دیتی ہے۔ کیونکہ آدمی جب اپنے آپ کو نیکو کار سمجھنے لگتا ہے تو اپنے پر مطمئن ہو کر سعادت اُخروی سے محروم ہو جاتا ہے۔

حضرت بشر بن منصور نے ایک مرتبہ دیر تک نماز پڑھی، اتفاق سے ایک شخص انکو دیکھ رہا تھا چونکہ وہ ان کے بارے میں خود پسندی کا شبہ کر سکتا تھا۔ اس لئے نماز سے فارغ ہو کر فرمانے لگے "میاں میری اس حالت سے دھوکہ نہ کھاؤ، شیطان نے چار ہزار برس اللہ کی عبادت کی مگر اس کا جو انجام ہوا، سب کو معلوم ہے ۔۔۔ غرض کہ مسلمان کی یہ شان نہیں کہ اپنی عبادت کو عبادت اور طاعت کو طاعت سمجھے کیونکہ اول تو قبولیت کا علم نہیں جس سے پتہ چلے کہ عبادت واقعی عبادت ہوئی۔ دوسرے اعتبار تو خاتمہ کا ہے اور خاتمہ کا حال کوئی جانتا نہیں کہ کس حال پر ہوگا۔؟

خود پسندی اور تکبر میں فرق

خود پسندی بھی تکبر کی ایک شاخ ہے، مگر فرق صرف اتنا ہے کہ تکبر میں اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھا جاتا ہے اور خود پسندی میں آدمی اپنے نفس کو اپنے خیال میں کامل سمجھتا ہے۔ نیز حق تعالیٰ کی نعمتوں کو اپنا حق سمجھ کر ان کو فضلِ خداوندی نہ سمجھنا اور ان کے زوال سے بے خوف ہو جانا خود پسندی اور عجب ہے۔

ناز کیا ہے؟

خود پسندی یہاں تک پہونچ جائے کہ حق تعالیٰ کے نزدیک اپنے آپ کو ذی رتبہ اور با وصف سمجھنے لگے تو یہ ناز کہلاتا ہے۔

ناز کی علامت اور اس کا اثر نازیہ ہے کہ اپنی دعا کے قبول نہ ہونے سے تعجب اور اپنے

دشمن کو سزا و عذاب نہ ملنے سے حیرت ہوتی ہے اور نفس کہتا ہے کہ ہم جیسوں کی دعائیں کیوں قبول نہ ہو اور ہمارے دشمن کیوں نہ پامال ہوں یاد رکھو کہ اپنی عبادت پر نازاں ہونا اور اپنے آپ کو مقبولِ خدا اور کسی قابل سمجھنا بڑی حماقت ہے۔ ہاں اگر اللہ کی نعمت پر خوش ہو اور اس کے زوال کا خوف ہو کہ وہ مالک و مختار ہے جس وقت چاہے اس کو مجھ سے لے لے تو یہ خود پسندی نہیں ہے۔

خوبیوں کی اقسام

خوبیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک غیر اختیاری اور دوسری اختیاری اور ظاہر ہے کہ یہ سب زائل اور فنا ہونے والی ہیں۔ اور ذرا سی بات پر سب ختم ہو جائیں گی۔ ان کے متعلق یوں سوچو کہ ان کے حاصل ہونے میں میرا دخل ہی کیا ہے۔ حق تعالیٰ کا محض فضل و احسان ہے کہ اس نے بلا استحقاق مجھ کو یہ خوبیاں عطا فرما دیں۔ پس اس ناپائیدار عطیہ بخشش پر عجب اور بڑائی کا کیا موقع ہے؟

اختیاری خوبیوں کی حقیقت

اگرچہ یہ مسلّم ہے کہ انسان کو اختیار و ارادہ دیا گیا ہے جس سے وہ اچھے یا بُرے کام کرتا ہے مگر اختیار و ارادہ کے لئے اسباب کا مہیا کرنا اور کامیابی دینا خدا ہی کے اختیار میں ہے اگر علم و عمل یا زہد و تقویٰ اور عبادت و ریاضت جیسے اختیاری افعال پر ناز ہو تو غور کرو کہ یہ کمالات اور محاسن کیسے حاصل ہوئے۔ اگر حق تعالیٰ ذہن، طاقت، ہمت، دماغ، بینائی، ہاتھ، پاؤں اور اقتدار و ارادہ مرحمت نہ فرماتا تو کوئی کمال کیونکر حاصل ہوتا۔ پس اس میں ناز کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

علم و عقل پر ناز کرنا اور زوال کا استحقاق

بعض سمجھدار اور پڑھے لکھے لوگ بھی جاہل بن جاتے اور اپنی عقل و علم پر ناز کرنے لگتے ہیں اگر کسی جاہل اور بے وقوف کو مالدار پاتے ہیں تو تعجب کرتے ہیں کہ

ایسا کیوں ہوا ہم عالم و عاقل ہو کر مالداری سے محروم رہیں اور یہ جاہل و نادان ہو کر مالدار بنجائیں۔

بھلا کوئی پوچھے کہ علم و عقل تم کو نصیب ہوئے اور جاہل اس نعمت سے محروم رہا تو اسے دوسری نعمت ملی پھر اس پر تعجب اور افسوس کیوں ہو۔ کیا تم ایک نعمت کو دوسری نعمت کا سبب سمجھ کر اس پر اپنا استحقاق جتاتے ہو؟ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ علم و مال دونوں چیزیں تم ہی کو دیدی جاتیں، اور جاہل فقیر دونوں سے محروم رہتا کیونکہ ایک کو تو سب کچھ ملا، اور دوسرے کو کچھ بھی نہیں ملا۔ اگر بادشاہ تم کو گھوڑا دے اور دوسرے کو غلام تو کیا تم کو یہ کہنے کی ہمت ہوگی کہ اس کو غلام کیوں دیا گیا۔ اس کے پاس گھوڑا تو ہے ہی نہیں اور میرے پاس چونکہ گھوڑا ہے اس لئے غلام بھی مجھ ہی کو ملنا چاہئے تھا، ایسا خیال کرنا بڑی ہی بے وقوفی ہے۔

عقلمندی کی بات یہی ہے کہ عطاء خداوندی پر شکر کرو اور اس کا بڑا کرم سمجھو کہ اس نے اب تک تم پر بلا استحقاق کرم فرمایا ہے اور عقل و علم جیسی نعمت بخشی جس کے مقابلہ میں مال کی کچھ بھی حقیقت نہیں، نیز تم کو شکر گذاری اور عبادت کی توفیق بخشی اور دوسروں کو اس سے محروم رکھا اور یہ محرومی بھی کسی جرم کی سزا یا قصور کا بدلہ نہیں، پس جب ایسا خیال کرو گے تو خوف الٰہی پیدا ہوگا اور سمجھو گے کہ جس نے بلا استحقاق انعام فرمایا اگر وہ بلا قصور کے اس نعمت کو چھین لے تو چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ جب یہ خیالات ذہن نشین ہوں گے تو خوف و خشیت دل پر طاری ہوگی اور عجب و خود پسندی سے نجات مل جائے گی۔

ریاء کی حقیقت

ریا کی اصلیت یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اپنی عبادت اور عملِ خیر کے ذریعہ سے وقعت اور منزلت کا خواہاں ہو جو مقصودِ عبادت سے قطعاً خلاف ہے کیونکہ عبادت سے مقصود صرف حق تعالیٰ کی رضامندی ہے اور اب چونکہ اس مقصود میں دوسرا مقصود یعنے رضاء خلق اور حصول منزلت شریک ہوگیا۔

اس کا نام شرکِ اصغر ہے۔

ریا کی صورتیں ریا عموماً چھ ذریعوں سے ہوتی ہے۔

اول: بدن کے ذریعہ ریا۔ مثلاً جسم میں شکستگی، ضعف، غنودگی اور پلکوں کا جھپکانا ظاہر کیا جائے تاکہ لوگ روزہ دار اور شب بیدار خیال کریں یا غمگین صورت بنائے تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کو آخرت کی بڑی فکر ہے یا پراگندہ بال کئے رہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ دین میں اس قدر مشغولیت ہے کہ بال کی بھی فرصت نہیں یا آواز پست اور آہستہ آہستہ نکالے تاکہ لوگ سمجھیں کہ ریاضت و مجاہدہ کرتے کرتے اتنا ضعف ہو گیا ہے کہ آواز تک نہیں نکلتی۔

دوم: ہیئت کے ذریعہ ریا: مثلاً رفتار میں نرمی اور ضعف ظاہر کرنا یا سر جھکانا سجدہ کے نشان کو باقی رکھنا اور ایسی صورت بنانا جس سے لوگ سمجھیں کہ حالت وجد میں ہے یا مکاشفہ میں مشغول ہے یا فکر میں مستغرق اور محو ہے۔

سوم: شکل و شباہت اور لباس کے ذریعہ ریا: مثلاً کمبل یا موٹے جھوٹے کپڑے پنڈلی تک پاجامہ چڑھانا، کپڑوں کا بوسیدہ اور میلا کچیلا رکھنا تاکہ لوگ صوفی سمجھیں یا عمامہ پر رومال باندھے رکھنا، اور جرابیں پہنے رہنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ اتنے متقی ہیں کہ راستے کے غبار سے تک پرہیز کرتے ہیں۔ پھر ریاکاروں میں دو قسم کے ہوتے ہیں۔ بعض لوگ صوفیوں اور دین داروں کے دلوں میں قدر و منزلت کے طالب ہوتے ہیں اور ہمیشہ اسی نیت سے میلے کچیلے اور پرانے کپڑے پہنتے ہیں۔ اگر کوئی نیا کپڑا جس کا پہننا شرعاً مباح ہو، ان کو پہننے کے لئے دیا جائے تو ان کو بظاہر بہت ہی ناگوار گذرتا ہے۔ کیونکہ اس سے ان کا مطلب یوں فوت ہو جاتا ہے کہ لوگ صاف ستھرا کپڑا پہنے ہوئے دیکھیں گے تو ان کی وہ قدر نہ کریں گے جو میلے کپڑوں میں کرتے تھے۔

بعض لوگ امیروں اور تاجروں میں وقعت پیدا کرنے کیلئے سوچتے ہیں کہ اگر پھٹے پرانے کپڑوں سے امیروں میں وقعت نہیں ہوگی بلکہ ان کو ہمارے بیٹھنے سے بھی نفرت ہوگی اور اگر لباس فاخرہ ہو، تو یہ لوگ زاہد و صوفی سمجھیں گے لہٰذا اس کے لئے یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ قیمتی اور باریک کپڑوں کو گیروا یا آسمانی رنگوا لیتے ہیں۔ قیمت میں شاہانہ شوکت اور رنگ روپ میں درویشانہ اور صوفیانہ شان معلوم ہوتی ہے اس طرح پر اپنا مطلب حاصل کرنے کیلئے ریا کار بنتے ہیں۔

چہارم گفتگو اور زبان کے ذریعہ ریا بعض واعظین اپنی زبانیں موڑ موڑ کر مقفے اور مسجع عبارتیں بنا کر بڑوں اور بزرگوں کی نقل اتارتے ہیں اور محض دکھاوے کی غرض سے کبھی آواز کو باریک اور کبھی غمگین بناتے ہیں۔ اس تصنع اور بناوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑے عالم اور صوفی اور سلف کا نمونہ ہیں۔ اس طرح حدیث دانی اور مشائخ و علماء زمانہ سے ملاقات کا دعویٰ کرنا کہ فلاں بزرگ کی زیارت کی، فلاں شیخ ہم سے ملے یا کسی حدیث کے متعلق صحیح یا ضعیف ہونے کا جلدی سے حکم لگا دینا تاکہ لوگ محقق و محدث سمجھیں یا بدکاری و معصیت کے تذکرہ پر زبان سے آہ اور ہائے افسوس کے کلمات نکالنا یا خلاف شرع باتوں سے اس طور پر نفرت ظاہر کرنا اور کڑھنا کہ دل میں رنج یا نفرت کا نام بھی نہ ہو، بلکہ یہ سب اس غرض سے ہوتا ہے لوگ ان کو پارسا، اللہ والا اور متبع شریعت سمجھیں، یہ سب زبان اور گفتگو کی ریا ہے۔

پنجم عمل میں ریا نماز میں قیام زیادہ کرنا، رکوع و سجدہ میں دیر تک رہنا، سر جھکانا، کسی کی طرف توجہ نہ کرنا، پلکوں کو جھکائے رکھنا، تاکہ لوگ عابد و زاہد اور باہمت اور پارسا سمجھیں۔

ششم اظہار دینداری ذریعہ ریا اپنے شاگردوں اور مریدوں کی کثرت کا یا اپنے مشائخ کی کثرت کا تذکرہ کرنا تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کی بڑے بڑے مشائخین سے ملاقات ہے۔ بعض لوگ تدبیر کرتے ہیں کہ کسی طرح امراء، علماء و صلحاء ان کی زیارت کرنے کو آنے لگیں اور ان کے بارے میں مشہور ہو جائے کہ فلاں شخص بہت بڑے بزرگ ہیں، یہ سب دین میں ریاکاری ہے۔

ریا حرام اور گناہ کبیرہ ہے ریا کے حرام ہونے کی دو وجوہ ہیں:
اول یہ کہ اس میں لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنا مقصد بنانا ہوتا ہے اور دھوکہ دینا حرام ہے۔

دوم: ریاکاری حق تعالیٰ کی شان میں گستاخی ہے، کیونکہ اس سے عبادت میں حق تعالیٰ کی خوشنودی مقصود نہ رہی بلکہ اس کے بندوں کی رضا مطلوب ہوئی تاکہ لوگ اس کو نیکوکار سمجھ کر اس کے معتقد ہوں تو گویا اللہ تعالیٰ کی عبادت کو ریاکاری کی وجہ سے بندوں کی نذر کر دی، اسی وجہ سے ریا کو شرکِ اصغر کہا گیا ہے۔

ریا کی کیفیت میں کمی بیشی پر گناہ کی کمی و زیادتی نیت میں جتنا زیادہ فساد ہوتا ہے اسی قدر گناہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ بعض ریاکاروں کا مقصود تو صرف یہی ہوتا ہے کہ لوگ ہماری عزت کیا کریں۔ اور بعض کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ لوگ ہم کو دین دار سمجھ کر ہمارے پاس امانتیں رکھیں۔ تاکہ اس کو اپنے قبضہ میں لاکر اڑانے اور کھانے کا موقعہ ملے، ظاہر ہے کہ اس کا گناہ پہلے کے مقابل میں زیادہ ہے۔ بعضوں کا یہ منشا ہوتا ہے کہ ہم کو نیک بخت سمجھ کر عورتیں امرد لڑکے ہمارے پاس آنے لگیں، اور اس نیکی کی آڑ میں شکار کھیلتے روسیاہی و بدکاری کا موقع

ملے یا ان ناسمجھ اور نادان عورتوں اور بچوں سے کچھ مال ہاتھ آجائے تاکہ فسق وفجور اور لہو ولعب کا موقع ملے۔ اس تیسری صورت میں پہلی دونوں صورتوں سے زیادہ گناہ ہے۔ کیونکہ اس شخص نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کو معصیت کا آلہ کار اور خدائے جبّار و قہار کی مخالفت کا ذریعہ بنایا۔

عبادات کے فرق سے ریا کے جرم میں کمی بیشی

جن عبادتوں میں ریا ہوتا ہے وہ بھی مختلف درجہ کی ہیں اور ان میں بعض کا گناہ بعض سے بڑھ جاتا ہے۔

اول درجہ کی ریا اصل ایمان میں ریا کرنا ہے، جیسے کہ منافق کے دل میں ایمان کا نام بھی نہیں ہوتا، مگر اپنی صورت مسلمانوں کی سی بنائے رہتا ہے۔ تاکہ لوگ اسے کافر سمجھ کر اس کے جان و مال کو حلال نہ سمجھیں یا ملحد اور مرتد جو اصل ایمان سے برگشتہ ہے۔ مگر کسی مصلحت یا لحاظ سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے۔ اس اصل ایمان میں ریا کا گناہ بہت سخت ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں جائیں گے۔

دوسرے درجہ کی ریا، اصل عبادت میں ریا کرنا ہے، مثلاً لوگوں کے سامنے تو نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا مگر تنہائی میں جب کوئی شخص دیکھتا نہ ہو تو نماز نہ پڑھنا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ عبادت محض لوگوں کو دکھانے کے لئے تھی۔ اور اللہ تعالیٰ دلوں کے حالات سے واقف ہے اور خوب جانتا ہے کہ یہ عبادت کس نیت سے ہوتی ہے، اس ریا کا درجہ اگرچہ پہلے سے کم ہے، پھر بھی نہایت سخت قسم کا شرک اصغر ہے۔ عبادات میں ریا کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ فرائض میں تو ریا نہ ہو مگر مستحبات اور نوافل لوگوں کو دکھلانے کے لئے ادا کیا جائے مثلاً لوگ موجود ہوں تو نفلیں زیادہ پڑھ لے اور فرائض سنبھل سنبھل کر ادا کرے۔ جب جو اور عاشورہ کا دن آئے تو اس کا روزہ ضرور رکھے۔ زکوٰۃ دیتی ہو تو لوگوں کی موجودگی یا موجودہ

اور نفیس مال کو زکوٰۃ میں نکالے اور سفر یا تنہائی ہو تو نہ نماز ٹھیک طرح ادا ہو، نہ نفل نمازیں اشراق وغیرہ باقی رہیں، فرض نماز بھی نہایت لاپرواہی سے پڑھے اور زکوٰۃ بھی محض بوجھ اتارنے کے لئے ردّی مال میں سے دے۔ پس اس ریا کا گناہ ایمان اور فرائض میں ریا کرنے سے کم ہے، مگر یہ بھی حرام اور دین کی بربادی کے لئے کافی ہے۔

ریا کے قصد میں تفاوت کی وجہ سے گناہ میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک صورت تو یہ ہے کہ عبادت سے مقصود محض دکھاوا ہو۔ عبادت کا قصد ہی نہ ہو، جیسے بلا وضو لوگوں کو دکھلانے کے لئے نماز پڑھنا، یا لوگوں کو دکھلانے کے لئے یوں روزہ رکھنا کہ خلوت میں گیا اور افطار کیا، پس اس کا گناہ تو سخت ہے۔ ــــ دوسری صورت یہ ہے کہ عبادت بھی مقصود ہے اور ساتھ ہی اس میں ریا کی بھی آمیزش ہے۔ اس کے تین درجے ہیں:

پہلا درجہ: یہ ہے کہ مقصود محض عبادت ہو جس کی شناخت یہ ہے کہ تنہائی میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہے جس طرح لوگوں کی موجودگی میں پڑھ رہا ہو۔ مگر چونکہ دوسروں نے نماز پڑھتے ہوئے اس کو دیکھا ہے اس لئے طبیعت خوش ہو گئی اور نماز کا پڑھنا گراں معلوم نہ ہو، پس اگر اتنی ہی بات ہے تو امید ہے کہ حق تعالیٰ اس عبادت کو قبول فرمائے اور ... پر ثواب بھی مرحمت فرما دے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس ریا کی سزا بھی دے یا اس کی بہ سے اجر و ثواب میں کمی فرما دے۔

دوسرا درجہ: یہ ہے کہ عبادت کا قصد مغلوب اور دکھانے کا قصد غالب ہو کہ جتنی عبادت لوگوں کی موجودگی میں کرتا ہے اس قدر تنہائی اور خلوت کی حالت میں نہیں ہو سکتی۔ پس یہ عبادت جس میں ریاکاری کی یہ حالت ہو کسی طرح بھی قبول ہونے کے قابل نہیں، کیونکہ اگرچہ اس میں عبادت کا بھی ذرا سا ارادہ شامل ہے مگر وہ اتنا مغلوب ہے کہ اس کا کچھ اعتبار نہیں ہے

لہٰذا اس کو صرف ریاکاری سمجھا جائے گا اور ایسی عبادت پر سخت عذاب کا اندیشہ ہے۔

تیسرا درجہ: یہ ہے کہ عبادت اور ریا دونوں مساوی درجہ میں ہوں، مثلاً عبادت سے جس قدر طاعت خدا مقصود ہو اسی قدر لوگوں کو دکھانا بھی مقصود ہو، اس میں نفع و نقصان چونکہ دونوں برابر ہیں اس لئے ممکن ہے کہ اس پر نہ عذاب ہو اور نہ ثواب ملے مگر چونکہ حق تعالیٰ فرماتا کہ جملہ شرکا میں سب سے زیادہ شرک سے بے نیاز میری ذات ہے تو کچھ عجب نہیں کہ اس صورت میں بھی نقصان کو ترجیح دے کر عبادت کو باطل کیا جائے۔ پس غیب کی خبر تو علام الغیوب کو ہے کہ ایسے شخص سے کیا معاملہ ہوگا، لیکن بظاہر حال یہ حالت گناہ سے خالی نہیں معلوم ہوتی۔

ریا جلی و خفی اور اخفیٰ و اشد خفا

ریا کبھی تو جلی اور ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً یہ حالت کہ تنہائی میں ایسی عبادت نہیں ہوتی جیسی لوگوں کے سامنے ہوتی ہے اور کبھی خفی اور پوشیدہ ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی شخص تہجد کی نماز تو پڑھتا ہے مگر جب کوئی مہمان آجاتا ہے تو اس کے سامنے اس کے نشاط اور مسرت میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ پس یہ بھی ریا ہے مگر پہلے کی بہ نسبت اس میں خفا ہے اور اس بھی زیادہ مخفی ریا یہ ہے کہ کسی کے موجود ہو جانے سے نشاط میں بھی زیادتی نہ ہو۔ مگر اثناء عبادت میں یا عبادت سے فارغ ہونے کے بعد اگر کوئی شخص اس کی اس عبادت پر مطلع ہو جائے تو اس کے دل میں ایک قسم کی فرحت اور خوشی ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ریا دل کے اندر اس طرح چھپی ہوئی ہے جیسے راکھ کے اندر چنگاری، اور اس سے بھی زیادہ خفی ریا یہ ہے کہ اطلاع سے بھی خوش نہ ہو لیکن آرزومند رہے کہ کاش لوگ میری تعظیم کریں، سلام اور مصافحہ میں ابتداء اور معاملات میں میری رعایت کریں، ان خیالات اور آرزوؤں سے معلوم ہوا کہ لوگوں پر اپنی طاعت و عبادت کا احسان رکھنا چاہتا ہے۔ اگرچہ اس نے لوگوں سے اپنی ریا کو چھپا

رکھتا ہے۔ مگر اس کا اتنا اثر ضرور ظاہر ہے کہ توقیر اور احترام کی خواہش ہے اس قسم کی ریا بھی گناہ میں داخل ہے اور اس سے بھی اعمال کے حبط ہو جانے کا اندیشہ ہے پس اگر خلاصی درکار ہو تو اپنی عبادتوں کو لوگوں کی نظروں سے بے حد چھپانا چاہیئے۔ لوگوں کا موجود ہونا اور نہ ہونا عبادت میں برابر ہو، اور ان کا جاننا اور نہ جاننا، ان کی واقفیت اور ناواقفیت، غرض کوئی بات بھی قابل اعتبار نہ ہو، چونکہ خدا ہی کا جاننا کافی ہے، لہٰذا اپنی عبادت اسی کو دکھاؤ کہ وہی اجر اور ثواب دے سکتا ہے۔ اور وہی عبادت کا قدرداں ہے، اس کے سوا دنیا اور دین میں کوئی ایسا نہیں جو کسی کو کچھ بھی دے سکے اگر ایسا کرو گے تو اپنی عبادتوں سے ضرور نفع پاؤ گے۔

عبادت میں ریا کے اقسام

یہ خیال ہو سکتا ہے کہ خفی ریا سے تو بچنا محال ہے البتہ جلی ریا سے آدمی بچ سکتا ہے، پھر معلوم نہیں کہ کونسی عبادت صحیح ہے اور کونسی فاسد، اس لئے اس کی تشریح یوں سمجھنی چاہیئے کہ عبادت میں ریاء تین طرح پر ہوتی ہے۔

۱۔ شروع ہی سے عبادت میں ریا ہو مثلاً نماز کا پڑھنا، اول سے لیکر آخر تک سب محض لوگوں کے دکھانے اور اپنے آپ کو نمازی کہلانے کے لئے ہو تو یہ صورت نماز کے لئے مفسد ہے یہ نماز ہی صحیح نہ ہوگی کیونکہ اس میں عبادت کی نیت ہی نہیں ہوئی، اور بلا نیت کے کوئی عمل معتبر نہیں، یا مثلاً کوئی شخص نماز خلوت ہو یا جلوت، دونوں صورتوں میں پڑھتا ہے مگر اول وقت میں پڑھنا ریاء کی غرض سے ہو تو اس صورت میں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرض ادا ہو جائے گا، البتہ اول وقت کی فضیلت حاصل نہ ہوگی کہ اس میں ریا موجود ہے۔ رہی یہ بات کہ ریا کا قصد عبادت میں شامل ہو سو اس کا گناہ جدا ہوگا۔

۲۔ اثنائے عبادت میں ریا، مثلاً نماز میں کوئی بھولی ہوئی چیز یاد آگئی یا کوئی تماشہ ہونے

لگا تو دل للچایا کہ نماز توڑ کر اُدھر متوجہ ہو جائے پس اگر ایسی حالت ہے کہ تنہائی کا موقعہ ہوتا اور کسی کا لحاظ مانع نہ ہوتا تو ضرور نماز توڑ دیتا مگر چونکہ آدمی بیٹھے ہوئے ہیں اس لئے ان کے خیال سے نماز نہ توڑے اور بادل نخواستہ پڑھتا جائے تو اس نماز کو بھی باطل کہیں گے کیونکہ عبادت میں اول سے آخر تک نیت کا ہونا ضروری ہے اور جب درمیان میں ریا کی وجہ سے عبادت کی نیت جاتی رہی تو عبادت میں خلل پیدا ہو گیا۔ یا مثلاً کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہے اور لوگوں کو اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر اس خیال سے کہ میری عبادت پر یہ لوگ مطلع ہو گئے ہیں اس کی طبیعت کو اس قدر خوشی ہوئی کہ عبادت کی اصل نیت بالکل مغلوب ہو گئی۔ اور نماز کا کوئی رکن ایسی حالت میں ادا ہوا جس میں اس خوشی کو زیادہ دخل تھا تو غالب ہے کہ یہ نماز بھی صحیح نہیں ہوئی کیونکہ اس میں اگرچہ نیت منقطع نہیں ہوئی مگر اتنی مغلوب ہو گئی کہ اس کا عدم و وجود برابر ہے۔ لہٰذا اس نماز کو بھی باطل کہا جائے گا۔ ہاں اگر اسے ایسی معمولی خوشی ہو جو نیت پر غالب نہ آئے اور عبادت کا محرک اور اصل باعث محض رضائے حق اور حکم خداوندی ہی رہے تو یہ نماز صحیح ہو جائے گی مگر قصد ریاء کا گناہ ضرور ہوگا۔

۳۔ عبادت کے بعد ریا: مثلاً عبادت کے ختم ہو جانے پر لوگوں کو اس کی عبادت پر آگاہی ہونے سے اس کو مسرت ہوئی یا لوگوں سے بطور فخر اس کا اظہار کرتا پھرا تو اس کو عبادت صحیح اور فاسد ہونے سے کوئی علاقہ نہیں اس لئے کہ جس وقت ریا ہوئی، اس وقت عبادت ختم ہو چکی تھی، البتہ اس مسرت اور اظہار کا گناہ ہوگا، پھر یہ عبادت کا اظہار صراحتاً یا کنایتاً جس طرح اور جس حیثیت سے ہوگا اس سے ریا کے جلی و خفی ہونے کا اندازہ ہو سکے گا یعنی اگر صراحتہً اظہار ہے تو ریا جلی ہے اور اشارۃً ہے تو ریا خفی ہے۔

ریا کے اسباب اور اس کا علاج ریا نہایت مہلک مرض ہے اس کا علاج نہایت توجہ

اور اہتمام کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ ریا کے چند اسباب ہیں :-

۱۔ اپنی مدح اور تعریف کی خواہش ۲۔ مذمت کا خوف ۳۔ مال اور دنیا کی طمع و حرص۔ چونکہ ہر سبب کا علاج جداجدا ہے' اس لئے ہر ایک کی تشریح بھی علیحدہ علیحدہ ہوگی۔

۱۔ مثلاً کوئی شخص میدان جنگ میں اس غرض سے بہادری دکھائے کہ اس کو شجاع اور بہادر کہیں' یا اس نیت سے عبادت کرے کہ لوگ اس کو پرہیزگار اور عبادت گزار کہیں تو یہ حب مدح ہے اور اس کا علاج وہی ہے جو حب مدح کے متعلق پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ شہرت اور دنیا کی نیکنامی محض فرضی اور وہمی اور ناقابلِ اعتبار کمال ہے۔ آج ہم مرے' کل دوسرا مرا' تعریف کرنے والے ان کی تعریفیں' قصیدے اور سپاس نامے یہیں رہ جائیں گے اور کسی سے کچھ بھی نفع حاصل نہ ہوگا' حقیقی مال وہ ہے جو مرنے کے بعد بھی ساتھ رہے۔ یعنی معرفت الہٰی کہ اس کو کبھی فنا ہی نہیں' اس کے علاوہ یہ خیال کرنا بھی اس مرض ریا کے لئے مفید ہے۔ کہ یہی عبادت اور یہی بہادری جو آج مجھ کو لوگوں کی زبان سے شجاع اور عابد کہلا رہی ہے۔ کل قیامت کو حشر کے میدان میں ساری مخلوق کے سامنے مجھ کو رسوا اور ذلیل کرائے گی کہ میرا نام فاجر' مکار اور ریاکار رکھا جائے گا۔ اور اس پر طرہ یہ کہ میرا کیا کرایا سب بیکار ہو جائے گا اور جن اعمال کو بڑی محنت اور مشقت کے ساتھ جمع کیا تھا' حبط ہو جائیں گے پس لوگوں کی خوشنودی اور دنیا کی اس ناپائیدار مدح و تعریف کے معاوضہ میں حق تعالیٰ کا غصہ اور محشر کی رسوائی و ذلت خریدنا کس قدر عقل و دانش کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں دنیا میں جن کی رضامندی چاہتے ہیں' اگر حق تعالیٰ چاہے تو ہم سے ان کو بھی ناراض کردے اور مدح کے بدلہ میں وہی لوگ ہماری مذمتیں کرنے لگیں۔ کیونکہ قلوب بنی آدم اور ان کی زبانیں تو اسی خلاق عالم کے قبضہ میں ہیں۔

۲۔ اسی طرح اگر مذمت کا اندیشہ ریا کا باعث ہو تو یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ اگر میں عند اللہ پسندیدہ ہوں تو لوگوں کی مذمت مجھ کو نقصان نہیں پہونچا سکتی ہے پھر میں اس سے کیوں ڈروں خصوصاً جبکہ یہ بات یقینی ہے کہ مخلوق کی اس مذمت کے موہوم اندیشہ کی وجہ سے حق تعالیٰ کو ناراض رکھنا' دنیا میں بھی ذلیل اور رسوا کر دیتا ہے' اگر یہ باطنی ریا لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ مجھے لوگوں کی مذمت سے ڈر معلوم ہوتا ہے اور اسی لئے میں نیکو کار کی سی صورت بناتا اور پرہیز گار بنا پھرتا ہوں تو پھر اس خوف سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا اور جس بات کا اندیشہ ہے وہ سامنے آجائے گی کہ مکاری کھلنے کی وجہ سے مذمتیں ہونے لگیں گی' اور اگر میں اخلاص کے ساتھ حق تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اطاعت کروں گا تو جن لوگوں کی مذمت کا مجھے خوف ہے وہ بھی میرے دوست بن جائیں گے اور حق تعالیٰ کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی۔

۳۔ ریا کا تیسرا سبب حرص اور طمع ہے' ایسی صورت میں خیال کرنا چاہیئے کہ جس چیز کی طمع ہے' اس کا حاصل ہو جانا ایک موہوم ہے' اور اس ریا کی وجہ سے حق تعالیٰ کی رضامندی سے محرومی یقینی ہے پھر بھلا کس نفع کی موہوم امید پر خدا کے غصہ کو سر پر لینا کون پسند کر سکتا ہے؟ چونکہ حق تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔ اس لئے یاد رکھنا چاہیئے کہ ریا کاری سے جس دنیوی مطلب کے لئے عبادت کر رہے ہو وہ بھی حاصل نہ ہو سکے گی' بلکہ مخلوق کے سامنے طمع کر کے ذلت و رسوائی الگ اٹھاؤ گے' ان کے احسان مند ہو گے اور ان کے سامنے ہمیشہ گردن نیچی رہے گی اور بے طمع ہو جاؤ گے تو حق تعالیٰ تمہاری تمام ضرورتوں کا کفیل ہو جائے گا" اور مخلوق خود بخود تمہاری مطیع بن جائے گی۔ اور پھر اخلاص کی بدولت جو دائمی اور لذیذ ترین نعمتیں تم کو آخرت میں ملیں گی۔ وہ اس کے علاوہ ہوں گی۔ غرض ان یقینی اور سچی

باتوں کو ذہن نشین کرلو گے تو ریا کا نام و نشان بھی نہ رہے گا۔

عبادت کو مخفی رکھنے کے منافع

بعض عبادتوں میں مخلوق کے مطلع ہونے پر یکایک ریا پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے خلوت میں بیٹھ کر عبادت کی جائے اور اپنی عبادت کو ایسا چھپایا جائے جیسا کہ عیوب اور معصیات کو چھپایا جاتا ہے عبادت کا اخفا ابتدا میں ذرا دشوار معلوم ہوتا ہے مگر چند روز کے بعد عادت پڑ جائے گی۔ اور خلوت کی عبادت و مناجات میں لذت آنے لگے گی۔

اظہار عبادت بعض مواقع پر مفید ہے

اس نیت سے عبادت کے ظاہر کرنے میں کچھ حرج نہیں کہ لوگوں کو رغبت ہو گی اور وہ بھی میری طرح حق تعالیٰ کی عبادت کرنے لگیں گے۔ ہاں نیت کا صاف اور خالص ہونا ضروری ہے کہ اگر نفس امارہ اس حیلہ سے تمہارا شکار کرنا چاہے یا اس سے کسی چھپی ہوئی خواہش کے بڑھنے کا اندیشہ ہو تو ہرگز اس کی جرأت نہ کرنا بلکہ اپنی عبادت کو مخفی ہی رکھنے کا پابند بنے رہنا۔ لہٰذا اپنے دل کو ٹٹولو کہ اس میں کیا خواہش ہے اگر یہ خواہش ہوئی کہ میری ہی عبادت دوسرے لوگوں کی عبادت کا ذریعہ بنے اور میں مقتدا بنوں اور مخلوق میری مقتدی ہو تو بس یہی ریا، طلب شہرت اور حب جاہ ہے کیونکہ اس صورت میں ظاہر ہے کہ اخلاص جاتا رہا اسی بنا پر اپنے گناہوں کا چھپانا جائز ہے۔ بشرطیکہ اس نیت سے ہو کہ لوگ فاسق نہ کہیں۔ گناہ کے مخفی رہنے پر گناہ نہیں ہے۔

اپنے گناہوں کے مخفی رہنے پر خوش اور آشکارا ہونے پر رنجیدہ ہونے میں کوئی

مضائقہ نہیں۔ اس کے تین سبب ہیں:

۱۔ اس میں حق تعالیٰ کے اس حکم کی موافقت ہے کہ وہ معصیت کے چھپانے کو پسند کرتا ہے اور اظہار معصیت کو ناپسند کرتا ہے۔

۲۔ اپنے اوپر سے ایذا رفع کرنے کے لئے کیونکہ معصیت کے فاش ہونے پر لوگوں کو مذمت اور برائیاں کرنے کا موقعہ ملے گا۔ اور اس سے دل پر صدمہ ہوگا اور یہ صدمہ اختیاری نہیں بلکہ طبعی ہے۔

۳۔ حق تعالیٰ کے شان ستاری پر خوشی کا ہونا، بہر حال کسی نیت سے بھی ہو گناہوں کے مخفی رہنے پر خوشی ہونا قبیح نہیں ہے۔ البتہ عبادت پر اس نیت سے خوش ہونا کہ لوگ تعریف کریں گے اور متقی عابد سمجھیں گے بلاشبہ حرام ہے کیونکہ یہ خوشی گویا عبادت کی اجرت لینا اور مخلوق کی مدح کو اپنی طاعت کا معاوضہ بنانا ہے۔

اس مضمون کو دوسرے طریقہ سے یوں سمجھنا چاہیئے کہ معصیت کے ظاہر ہونے میں عموماً حیا اور شرم آتی ہے اور حیا چونکہ ریا نہیں۔ لہٰذا وہ حرام اور ناجائز ہے۔ ریا کے اندیشہ سے اپنے معمولات کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ ریا کے خوف وخطرہ سے طاعت وعبادت کو چھوڑ دینا مناسب نہیں ہے بلکہ عبادت بدستور کرتے رہنا چاہیئے۔ اور اگر اس میں ریا پیدا ہو تو اس کے دور کرنے کی کوشش رکھو۔ البتہ نماز میں امام بنایا، مقدمات میں قاضی یا پنچ قرار پانا یا وعظ کہنا، یا اسی طرح ایسے کام میں جن کا تعلق مخلوق اور عوام سے ہو، اگر ان میں ریا کا غالب اندیشہ ہو تو بے شک ان کاموں سے بھاگنا چاہیئے کہ سلف کا یہی طرز تھا اور اسمیں بہتری ہے، اب رہے نماز و روزہ اور صدقات وغیرہ ضروری اعمال تو ان کو ریا کے اندیشہ سے ترک کرنا جائز نہیں ہے البتہ اگر بالکل ہی اخلاص اور رضاء حق اور عبادت خداوند

کی نیت نہ ہو بلکہ سراسر ریاکاری ہو تو اس وقت ان کو کرنا بھی حرام ہے اور اگر کسی نیک کام کے تم عادی اور پابند ہو اور اتفاق سے لوگ جمع ہو جائیں تو اس وقت ریا کے احتمال کی وجہ سے اپنے معمول کو ترک مت کرو بلکہ عادت کے موافق اپنا کام کرو اور ریا کو جہاں تک ہو سکے دفع کرو۔

حُسنِ خُلق اور فریبِ نفس

اخلاق ذمیمہ جن سے نفس کا تزکیہ ضروری ہے: یوں تو بہت ہیں مگر اصل میں یہی دس ہیں جن کو ہم تفصیل کے ساتھ ذکر کر چکے ہیں اور ان میں باہم ایسا تعلق ہے کہ ایک کے ساتھ دوسرا اور دوسرے کے ساتھ تیسرا لگا ہوا ہے لہذا جب تک سب سے نجات نہ ملے گی نفس قابو میں نہ آئے گا اور ایک کی اصلاح کرنا اور دوسرے سے بے پرواہ رہنا کچھ مفید نہ ہوگا۔ کیونکہ جو شخص دس بیماریوں میں گرفتار ہو وہ تندرست اسی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ اس کی تمام بیماریاں جاتی رہیں اور جس طرح کوئی خوبصورت آدمی حسین اسی وقت کہلا سکتا ہے جبکہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان غرض سارے اعضا مناسب اور خوبصورت ہوں، اسی طرح انسان کو حُسنِ خُلق اسی وقت حاصل ہوگا جبکہ اس کی تمام باطنی حالتیں قابلِ تعریف اور پسندیدہ ہوں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسلمان وہی ہے جس کا خُلق کامل ہو اور مومنوں میں افضل وہی ہے جس کا خُلق سب سے بہتر ہو، اسی اصل کا نام دین ہے اور اسی کی تکمیل کیلئے رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لائے تھے۔ پس سارے ہی اخلاق ذمیمہ سے صاف ہونا حُسنِ خُلق کہا جا سکتا ہے۔ حسن خلق کی تحقیق او تحدید اور ثمرات و نتائج میں محققین کے اقوال مختلف ہیں مگر ہم اختصار کے طور پر اس کی تحقیق کرتے ہیں۔

حُسنِ خُلق کی ماہیت و ثمرات

خَلق، خُلق، دو لفظ جدا جدا ہیں۔ اول صورت ظاہری

اور دوم صورت باطنی، انسان میں جس طرح ظاہری جسم شکل وصورت ہے جس کو آنکھ سے دیکھا جاتا ہے اسی طرح اس میں روح و نفس ہے اور اس کا ادراک بصیرت یعنی دل کی آنکھ سے ہوتا ہے، ظاہری شکل و ہیئت کو صورت کہتے ہیں اور باطنی شکل و ہیئت کو سیرت کہتے ہیں۔

سیرت کا مرتبہ سیرت کا مرتبہ صورت سے بڑھا ہوا ہے، سیرت کو حق تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ چنانچہ نفخت فیہ من روحی (اور آدم کے پتلے میں پھونک دیا میں نے اپنی روح) اور قل الروح من امر ربی (کہہ دو اے محمدؐ کہ روح میرے پروردگار کا امر ہے) روح امر ربانی ہے جسم کی طرح سفلی اور خاکی نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ جسم کی نسبت مٹی کی جانب فرمائی اور انی خالق بشراً من طین ارشاد ہوا۔ (بیشک میں نے پیدا کیا بشر کو مٹی سے) اس مقام پر ہماری مراد روح اور نفس سے ایک ہی ہے، یعنی وہ شئی جو حق تعالیٰ کے الہام و القاء سے اپنی استعداد کے موافق اشیاء کی معرفت اور ادراک حاصل کرتی ہے۔ اس طرح ثابت ہوا کہ زیادہ قابل لحاظ امر ربانی یعنی سیرت انسانی ہے اور جب تک اس باطنی ترکیب کی شکل و ہیئت میں حسن موجود نہ ہوگا انسان کو نیک سیرت نہیں کہا جا سکتا۔

سیرت کے قوائے اربعہ قوت علم، قوت غضب۔ قوت شہوت اور قوت عمل جس طرح ظاہری جسمانی اعضاء میں اعتدال نہ ہو، بلکہ کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا ہو تو وہ حسین نہیں ہو سکتا اسی طرح ان باطنی قوتوں میں بھی اعتدال ہوگا۔ تب ہی آدمی نیک سیرت ہوگا اگر کسی کی قوت غضبیہ، حد اعتدال سے کم ہے اور قوت شہوانیہ اعتدال سے بڑھی ہوتی ہے تو اس کو نیک سیرت نہیں کہہ سکتے۔

قوت علمیہ کا حسن قوت علمیہ کا حسن اور اعتدال یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے سچ اور

جھوٹ باتوں میں امتیاز اور اعتقادات میں حق و باطل کا فرق کرسکے اور اعمال میں حسن و قبح پہچان سکے جس وقت یہ صلاحیت پیدا ہو جائے گی، اس وقت حکمت کا ثمرہ پیدا ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق من اوتی الحکمۃ فقد اُوتِیَ خیراً کثیرا۔ (جس کو حکمت عطا ہوئی اس کو خیر کثیر عطا ہوئی) درحقیقت تمام فضیلتوں کی اصل یہی ہے۔

قوت غضبیہ اور شہوانیہ کا حُسن

ان کا اعتدال اور حسن یہ ہے کہ ہر دو قوتیں حکمت اور شریعت کے اشارہ پر چلنے لگیں اور سدھائے ہوئے مطیع شکاری جانور کی طرح شریعت کی یوں پابند بن جائیں کہ جس طرف شریعت چلائے بلا عذر و بے تامل اسی جانب چلیں اور جس وقت شریعت ان کو روکنا چاہے فوراً ٹھہر جائیں۔

قوت عدل کا حُسن

اس کا اعتدال یہ ہے کہ قوتِ غضبیہ و شہوانیہ دونوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے اور ان کو دین و عقل کے اشارہ کا ماتحت رکھے گویا عقل حاکم ہے اور قوت عدل اس کا شکار کہ جدھر حاکم کا اشارہ پاتی ہے اسی جانب جھک جاتی ہے اور اسی کے احکام جاری کر دیتی ہے اور قوت غضبیہ و شہوانیہ دونوں گویا شکاری کتے اور فرماں بردار گھوڑے کی طرح ہیں کہ ان میں حاکم کا حکم ہوتا ہے، جب یہ حالت قابل اطمینان ہو جائے گی اس وقت انسان خوش خلق اور نیک سیرت کہلائے گا۔

قوت غضبیہ کے اعتدال اور کمی بیشی کے نتائج

قوت غضبیہ کے اعتدال کا نام شجاعت ہے اور یہی عنداللہ پسندیدہ ہے اس میں زیادتی ہوگی تو اس کا نام تہوّر ہے اور کمی ہوگی تو بزدلی کہلائے گی۔

اور یہ دونوں حالتیں ناپسندیدہ ہیں، شجاعت سے لطف و کرم، دلیری، بردباری، استقلال، نرمی، ملاطفت اور ضبط و غصہ اور ہر کام میں دور اندیشی و وقار پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر اس میں زیادتی ہوئی تو ناعاقبت اندیشی، ڈینگ، شیخی، غصہ کی شدت، تکبر اور خود پسندی پیدا ہوتی ہے اور اگر اس میں کمی پیدا ہوتی ہے تو بزدلی، ذلت، بے غیرتی، کم ہمتی، خساست اور چھچھورے پن کی حرکات ظاہر ہوتی ہیں۔

قوت شہوانیہ کے اعتدال اور افراط و تفریط کے ثمرات

قوت شہوانیہ کے اعتدال کا نام پارسائی ہے اس کے گھٹنے اور بڑھنے سے حرص و ہوا پیدا ہوگی۔ پارسائی حق تعالیٰ کو پسند ہے اس سے حسب ذیل خصائل پیدا ہوتے ہیں:

سخاوت، حیا، صبر، قناعت، تقویٰ، خوف و خشیت اور دوسروں کی مدد کا مادہ پیدا ہوتا ہے اس میں افراط و تفریط سے۔ حرص، لالچ، خوشامد، چاپلوسی، امراء کے سامنے تذلل اور فقراء کی تحقیر۔ بے حیائی، فضول خرچی۔ ریا، تنگ دلی اور نامردانگی، حسد وغیرہ خصائل پیدا ہوتے ہیں۔

قوت عقل کے اعتدال اور افراط و تفریط کے آثار

قوت عقل کے اعتدال سے انسان مدبر، منتظم اور ذکی اور سمجھدار ہوتا ہے اس کی رائے صائب ہوتی ہے اور ہر معاملہ میں اس کی طبیعت جودت دکھلاتی ہے۔ اور اگر یہ قوت حد اعتدال سے بڑھ جائے تو دھوکہ بازی، فریب دہی اور مکاری کہلاتی ہے اور اگر اس میں ضعف اور نقصان ہو تو کند ذہنی، حماقت، اور بے وقوفی کہلائے گی۔

غرض نیک سیرت اور خوش خلق بننے کے لئے اعتدال نہایت ضروری ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ نہ اپنے ہاتھ گردن میں باندھ لو کہ بخل کرو اور نہ بالکل کھول دو کہ اسراف کرنے لگو، نیز فرماتا ہے نہ وہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ اس کے بین بین حالت پر رہتے ہیں۔

بدخلقی کا علاج نفس پر جبر کرنا ہے

بداخلاقیوں کی اصلاح چونکہ ریاضت اور مجاہدہ سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی میں کوئی بُرا خلق موجود ہو تو اس کو چاہیئے کہ نفس پر جبر کرے مثلاً اگر بخل کی عادت ہو تو جبراً و قہراً اس کو ترک کرے اور نفس کو ناراض کر کے خرچ کرنے کی عادت ڈالے اور اگر فضول خرچی کا خوگر ہو تو نفس کو فرضی سخاوت سے روکے اور خرچ کرنا جبراً بند کرے تاکہ کم خرچی کی عادت ہو جائے پھر جب عادت اصلاح پر آجائے گی تو بین بین کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ جو حق تعالیٰ کو پسند ہے۔

حسن خلق میں تکلف اخلاق حسنہ کا وسیلہ ہے

شروع میں اگرچہ بہ تکلف نیک کام کرو گے لیکن بعد میں یہ عادت ہو جائے گی اور اس میں اخلاص پیدا ہو جائے گا، اس لئے بہ تکلف کام کرنے سے رکنا نہ چاہیئے۔

حسن خلق کے مراتب و ثمرات

جس طرح حسن ظاہری میں تفاوت پایا جاتا ہے اس طرح اخلاق اور حسن باطنی میں تفاوت اور فرق ہے۔

سب سے زیادہ نیک سیرت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے آپ کی

نشان ہیں نصِ قرآنی ہے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ پھر جس قدر آپ کے ساتھ مناسبت ہوگی اسی قدر سیرت حسین ہوگی، پھر جس قدر نیک سیرت ہوگا اسی قدر محبوب اور مقبول ہوگا چونکہ محبت و نفرت کے درجات ہیں اس لئے مقبولیت اور محبوبیت کے بھی درجات ہوں گے۔

اخلاق کی تشخیص محبِ صادق کر سکتا ہے

انسان خود کبھی خوش خلقی اور حسن سیرت کو نہیں سمجھ سکتا کیونکہ نفس دھوکہ دینے والا اس کے ساتھ لگا ہوا ہے اس لئے ضرورت ہے کسی محب صادق سے اس کو معلوم کرو کہ وہ تم کو کیسا سمجھتا ہے۔

اگر متعدد خرابیاں ہوں تو پہلے اہم خرابی کی اصلاح کرو، مثلاً حُبِّ دنیا میں کم و بیش سب ہی مبتلا ہیں۔ پہلے اس کی اصلاح کرنی چاہیئے اس کا سبب بجز جہالت و غضب کے اور کچھ نہیں۔

دنیا کی محبت کا علاج

تھوڑی دیر کے لئے مان لو کہ تمہاری عمر سو برس کی بھی ہوئی اور تمہیں تمام روئے زمین کی سلطنت بھی مل گئی مگر پھر آخر فنا ہونا ہے اور عنقریب وہ دن آنے والا ہے کہ نہ تم رہو گے اور نہ سلطنت و ملک رہے گا۔ سب تو فنا ہو جائیں گے مگر ابدی سلطنت جس کے ختم ہو جانے کا کوئی وقت ہی نہیں، تمہارے ہاتھ سے ضرور جاتی رہے گی۔

ابد یعنی خلود و دوام کا تصور

اگر خلود و دوام کی مقدار تمہارے خیال میں نہ آسکے تو یوں تصور کرو کہ تمام دنیا اس کنارے سے اس کنارے تک اناج سے بھری ہوئی ہے اور ایک پرندہ پورے ایک ہزار برس میں اس بھری ہوئی

دنیا میں سے دانے اٹھالیتا ہے تو ہزار سال میں اناج کا ایک ایک دانہ اٹھانے پر بھی ایک نہ ایک دن یہ دنیا اناج سے ضرور خالی ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ مدت بھی ابد و دوام کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتی کہ ابد و دوام اس مدت سے بھی زیادہ ہے کیونکہ وہ تو اس مدت کا نام ہے جس کی کہیں انتہا ہی نہیں پھر بھلا اس عارضی اور فنا ہو جانے والی سلطنت کی جانب توجہ کرنا اور ابدی و دائمی مملکت سے بے پرواہ اور مستغنی بننا نفس نے کیوں پسند کر لیا پھر یہ بھی سوچو کہ ذرا سی دنیا کی معمولی تجارت میں کیسی کیسی مصیبتیں اٹھا لیتے ہو اور طلب ریاست کیلئے کیسے کیسے دشوار سفر اختیار کر لیتے ہو حالانکہ ان مصیبتوں اور دشواریوں کے بعد بھی مال اور ریاست کا ملنا موہوم ہے۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی موت آ جائے اور تجارت کا نفع اور سفر کا انجام دیکھنا نصیب نہ ہو یا اگر ریاست بھی مل جائے تو ممکن ہے کہ وہ عیش و آرام اور سکون و اطمینان حاصل نہ ہو جو ریاست سے مقصود ہوتا ہے۔ بہرحال ایسی موہوم دنیوی راحت کی توقع پر یہ صعوبتیں اور مصیبتیں تم کو گراں نہیں گزرتیں کیونکہ اپنے خیال میں جتنی عمر اپنی سمجھے ہوئے ہو اس کے مقابلے پر اس تکلیف و محنت کے ایک یا دو برس کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ ایک برس سفر میں رہنے کی تکلیف کے سبب عمر بھر کا عیش مل جائے گا حالانکہ جو نسبت تمہاری بلکہ تمام دنیا کی عمر کو ابد اور دوام کے ساتھ ہے اس کا ایک کرشمہ بھی ایک برس کو تمہاری خیالی عمر کے ساتھ حاصل نہیں۔ پس اگر دنیا کی زندگی کو آخرت کی ابدی نعمت کے حاصل کرنے میں صرف کرو اور چند روزہ محنت اور تکلیف کو وہاں کی دائمی لذت کے لئے گوارا کر لو تو کیا مشکل ہے۔

نفس کا دھوکہ

نفس نے ایک شوشہ چھوڑ دیا ہے اور دھوکہ میں ڈال رکھا ہے کہ غفلت کئے جاؤ اور کہتے رہو کہ خدا کریم ہے، معاف کرنے والا ہے،

سب کچھ بخش دے گا اور عمل کئے بغیر ہمیں جنت میں بھیج دے گا۔ اور تجارت میں ایسا کیوں نہیں خیال کرتے کیا آخرت کا خدا کوئی اور ہے اور دنیا کا کوئی اور۔ اور جب دونوں کا خدا ایک ہے تو دنیا کمانے کے متعلق اپنے ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر میں کیوں نہیں بیٹھتے اور کیوں نہیں خدا پر بھروسہ کرتے کہ جب وہ رزاق اور قادر ہے تو بغیر محنت کئے بھی ہمارا پیٹ بھر دے گا اور کیوں نہیں اس سے امید رکھتے کہ وہ کسی ویرانے کا خزانہ تم کو خواب میں دکھلا دیں گے جس سے بلا محنت تم مالا مال ہو جاؤ گے۔

بے محل توقع شیطانی دھوکہ ہے

پس ایسا ہی آخرت کے متعلق سمجھو کہ خراب اعمال اور بدکاریوں پر معافی و مغفرت کی توقع رکھنا اس سے بھی زیادہ بیکار اور عبث ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ صاف فرما چکا ہے (انسان کو وہی ملے گا جو وہ کرے گا اور متقی بندے فاسق اور فاجر لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے) اور دنیا کے معاملات میں تو اسباب کے اختیار کرنے کو ضروری بھی نہیں فرمایا بلکہ ان سے بے توجہ بنایا اور فرمایا کہ کوئی جاندار زمین پر چلنے والا ایسا نہیں ہے، جس کا رزق ہمارے ذمہ نہ ہو، پھر تعجب ہے کہ دنیا کمانے میں تو خدا پر بھروسہ نہیں اور آخرت میں بداعمال کی معافی پر بے جا توقع رکھ کر اپنا دین برباد کر رہے ہو۔ یاد رکھو کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے جس نے مخلوق کو تباہ اور اعمال سے کاہل بنا کر عبادت و طاعت سے روک رکھا ہے۔

غیب پر ایمان و یقین حاصل کرنے کا طریقہ

اگر تم کہو چونکہ دنیوی معاملات کے نتائج تو ہم آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور رات دن تجربہ کرتے ہیں مگر آخرت کے معاملات میں سے کوئی واقعہ بھی کسی نے مشاہدہ نہیں کیا۔ لہٰذا دنیا کمانے میں رغبت ہوتی ہے اور

دین کی طلب میں غفلت ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ تمہارے قلب کی آنکھیں روشن فرمادے اور تم صاحبِ بصیرت بن جاؤ تو پھر دینی امور کے انجام بھی دنیا ہی کی طرح تمہارے مشاہدے میں آجائیں گے اور اگر یہ بصیرت حاصل نہ ہو تو بصیرت والوں یعنی انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے ارشادات' ان کے حالات اور واقعات پر غور کرو گے تو تم کو آخرت پر سچا یقین اور قلب کو امورِ غیبیہ پر سکون و اطمینان حاصل ہو جائے گا کیونکہ جو شخص اندھا ہو اسے چاہیئے کہ وہ کسی آنکھوں والے کا تابع ہو کر چلے کیونکہ راستہ کی اونچ نیچ اور منزلِ مقصود تک پہونچنے والی سڑک اسی کو نظر آرہی ہے۔ اگر طب کے اندر تم کو دخل نہ ہو اور بیمار ہو جاؤ بتاؤ کہ اس وقت طبیب کے کہنے پر تم کو چلنے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ خصوصاً اگر کوئی ایسی صورت ہے کہ کسی مرض میں تمام اطباء کا اتفاق ہو تو اس میں تو تمہیں کسی قسم کا شک بھی نہ ہو گا۔

بس یہی حال عقائد کا سمجھو کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام اور تمام اہلِ بصیرت روحانی طبیب ہیں اور وہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ آخرت ضرور آنیوالی ہے اور اس چند روزہ زندگی کے نیک و بد اعمال کا بدلہ ضرور ملنے والا ہے۔ لہٰذا اس میں شک کرنے کی گنجائش ہی نہیں۔

روحِ انسانی کی حقیقت

روح کے متعلق عہدِ قدیم سے ایک نہ ختم ہونے والا سلسلۂ تحقیقات جاری ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ روح کی اصل کہنہ اور حقیقت آج تک کسی کو معلوم نہ ہو سکی اور نہ غالباً ہو سکے گی۔

آیاتِ قرآنیہ سے روح کے متعلق چند نظریات پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔ اس مادی جسم کے علاوہ انسان میں کوئی اور چیز موجود ہے' جس کو روح کہا جاتا ہے۔

اس کے موجود رہنے سے انسان زندہ رہتا ہے۔ اور اس کے نکل جانے سے آدمی مر جاتا ہے۔ وہ عالم امر کی چیز ہے اور خدا کے حکم اور ارادہ سے ظاہر ہوتی ہے۔

۲۔ روح کے لئے کچھ صفات ہیں جیسے علم و شعور وغیرہ اور وہ بتدریج کمال کو پہونچتی ہیں اور ان ارواح میں حصول کمال کے اعتبار سے تفاوت اور اختلاف ہے۔

۳۔ اس کے یہ کمالات ذاتی نہیں بلکہ وہاب حقیقی کے عطا کئے ہوئے ہیں اور محدود ہیں۔

۴۔ کتنی ہی کامل روح ہو مگر حق تعالیٰ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جس وقت چاہے اس سے کمالات کو سلب کر لے اگرچہ وہ اپنے فضل و کرم سے ایسا نہ کرے۔

یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امتحاناً دریافت کیا کہ روح کیا چیز ہے؟ اس پر حق تعالیٰ نے آیۃ نازل فرمائی یسئلونك عن الروح قل الروح من امر ربي وما اوتيتم من العلم الا قليلا ۝ یعنی روح امر ربی سے ہے تم اس کو سمجھ نہیں سکتے کیونکہ تمھیں علم نہایت قلیل دیا گیا ہے۔

موضح القرآن میں حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ نے کھول کر اور واضح طور پر روح کو بیان نہیں فرمایا کیونکہ ان میں سمجھنے کا حوصلہ نہ تھا، اس قدر جاننا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک چیز بدن میں آپڑی، وہ جی اٹھا، اور جب نکل گئی تو وہ مر گیا۔

درحقیقت روح دو ہیں: ایک روح حیوانی اور دوسری روح انسانی۔ روح حیوانی مادیات سے بنتی ہے اس طرح کہ غذا معدہ میں ہضم ہوتی ہے، اس سے اخلاط پیدا ہوتے ہیں اور اس کے بعض اجزاء فضلہ ہو کر خارج ہو جاتے ہیں، جن کو پیشاب، پاخانہ اور

بلغم وغیرہ کہاتا ہے اور خون قلب کی طرف روانہ ہوتا ہے اور وہ قلب کی گرمی سے پک جاتا ہے اس سے روح حیوان بنتی ہے اسی کو روح ہوائی بھی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت رُوح حیوانی بخار لطیف کا نام ہے۔ طب اور تصوف دونوں اس میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ طب دواؤں سے اور تصوف، عادات واخلاق کے اعتبار سے۔

روح انسانی بخارات سے پیدا نہیں ہوتی وہ ایک مستقل چیز ہے۔ جو عالم علوی سے اتاری جاتی ہے اور وہ روح حیوانی پر اس طرح مسلط کر دی جاتی ہے کہ وہ اس پر راکب ہو جاتی ہے اور وہ روح حیوانی اس کے لئے مرکب بن جاتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ روح حیوانی غذا کے عرق کھینچنے کے وقت نکلتی ہے جیسی دوائیں ہوتی ہیں۔ ویسا ہی عرق اور بخار اس میں سے نکلتا ہے۔ اسی طرح روح حیوانی غذاؤں کا خلاصہ اور عرق ہوتا ہے۔ برخلاف روح انسانی کے کہ اس میں اثر اخلاق اور اعمال کا ہوتا ہے اسی سبب کہا جاتا ہے کہ روح انسانی میں انصباغ ہوتا ہے۔

متکلمین کہتے ہیں کہ روح ایک جوہر ہے جو جسم میں حلول کئے ہوئے ہے۔ یعنی جس طرح آگ چنگاری میں حلول کئے ہوئے ہے اسی طرح روح جسم میں حلول کئے ہوئے۔ روح حال اور جسم محل ہے۔ یہ معاملہ روح حیوانی میں ہوتا ہے۔ چلنا پھرنا اور کام کاج کرنا یہ سب روح حیوانی کی کیفیات ہیں۔ متکلمین نے اسی پر اکتفا کیا ہے۔

روح انسانی جو عالم بالا سے آتی ہے اس کے متعلق ایک بحث یہ ہے کہ وہ مرکب ہے یا بسیط۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بعض ارواح پر خیر کا غلبہ ہوتا ہے اور بعض پر شر کا، بلکہ ایک ہی آدمی پر ایک وقت میں خیر غالب ہوتا ہے تو دوسرے وقت میں اس پر شر کا غلبہ ہوتا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ روح انسانی خیر و شر سے مرکب ہے۔ ظاہر ہے آدمی میں

عناصر اربعہ کا علم ہمکو اس کی مختلف کیفیات ہی سے ہوتا ہے ہم نے آدمی میں عناصر کو نہیں دیکھا لیکن اس پر کبھی حرارت کبھی برودت اور کبھی مائیت اور کبھی یبوست کا غلبہ ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان مختلف عناصر سے مرکب ہے۔ ٹھیک اسی طرح روح کے احوال مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی خیر کا غلبہ اور کبھی شر کا ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ روح انسانی ملکیت کا بھی مخزن ہے اور شیطانیت کا بھی اور یہ خیر و شر سے مرکب ہے۔ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ روح انسانی عالم ارواح سے اترتی ہے اور روح حیوانی پر قبضہ کر لیتی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ وغیرہ نے روح کے متعلق بہت سے اقوال نقل کئے ہیں۔ شیخ شہاب الدین سہروردی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہا اللہ نے اس کی کچھ تفصیل بیان کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ روح انسانی درحقیقت مادیات سے مخلوق نہیں بلکہ وہ عالم امر کی چیز ہے تمام ارواح عالم ارواح میں چھاؤنی کی طرح موجود رہتی ہیں ان کے کچھ احوال اہل تصوف و اولیاء اللہ بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ سیدی عبدالعزیز دباغ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو سیر کرائی۔ میں نے دیکھا کہ شہد کی مکھیوں کی طرح ارواح کے خانے ہیں، ان میں وہ رہتی ہیں۔ بعض شقی ہیں اور دوسری سعید ہیں، ان میں انصباغ کی اہلیت اور صلاحیت ہے۔ بعض ارواح پر مختلف رنگ تھے، اور بعض پر صرف ایک ہی رنگ تھا۔ جو ارواح دنیا میں آچکی ہیں ان پر اعمال کی وجہ سے مختلف رنگ تھے اور جو ابھی دنیا میں نہیں آئیں ان کے رنگ زیادہ نہ تھے بلکہ ایک ہی رنگ تھا۔

دنیا میں جس طرح کے اعمال خیر و شر کئے اسی کے موافق شقاوت و سعادت

میں وہ مبتلا رہتی ہیں۔

عالمِ ارواح سے منتقل ہو کر جب کوئی روح دنیا میں آتی ہے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے۔ چنانچہ تبریزیؒ اپنی کتاب میں کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ جب کسی روح کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے اور وہ ماں کے پیٹ میں جنین میں داخل ہوتی ہے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے جس طرح جیل میں داخل ہونے سے ہر شخص گھبراتا اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔

دراصل روح انسانی کو عالم بالا سے لاکر روحِ حیوانی کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ یہ بندش جب تک رہتی ہے، وہ روح وہاں رہتی ہے بعض کی بندش سخت ہوتی ہے اور بعض کی کمزور۔ نزع کے وقت ملک الموت اس بندش کو کاٹ دیتا ہے۔

آدمی کی موت کے وقت روح حیوانی بالکل فنا نہیں ہو جاتی بلکہ تھوڑی اس کے ساتھ جاتی ہے اور روح انسانی کچھ حصہ روح حیوانی کا اپنے ساتھ لے جاتی ہے، اور یہ روح حیوانی مادیات کی وجہ سے تکلیف اور راحت محسوس کرتی ہے۔

شیخ ابن عربیؒ نے اپنی مشہور کتاب فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم میں اس کی کافی تشریح کی ہے لیکن ہمارا اس کو سمجھنا اور روح کی حقیقت تک رسائی نہایت دشوار ہے، کیونکہ ہم معنوی اور مخفی چیزوں کو محسوسات کی نظائر اور مثالوں سے سمجھتے ہیں اور اس کی کوئی نظیر محسوسات میں پائی نہیں جاتی۔ لہٰذا اس کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ جس طرح جسم کے اعضاء ہیں، بعینہٖ اسی طرح روح کے اعضاء ہیں اور ان کی مختلف کیفیات ہیں جس طرح تمام انسانوں کے اعضاء یکساں نہیں، اسی طرح تمام ارواح کے اعضاء بھی یکساں نہیں ہوتے۔

مدارِ تکلیف اور ثواب و عقاب کا تعلق انسان سے ہے اور انسان نام ہے روح انسانی

اور روح حیوانی اور جسم کے مجموعہ کا مگر اصل چیز روح انسانی ہے چونکہ دوسرے دو یعنی جسم اور روح حیوانی بھی اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اس لئے ان پر بھی اثر ہوتا ہے۔ روح انسانی کی تکلیف سے روح حیوانی اور جسم بھی متاثر ہوتا ہے اور تکلیف محسوس کرتے ہیں۔
لہٰذا اولاً عذاب کا تعلق روح انسانی سے اور ثانیاً اور بالعرض جسم اور روح حیوانی سے ہوتا ہے، اور جب روح حیوانی کا تعلق جسم سے نہ رہیگا تو جسم پر مطلق اثر نہ ہوگا۔

پس جبکہ موت طاری ہوتی ہے تو روح حیوانی کا ایک بڑا حصہ روح انسانی کے ساتھ جاتا ہے کیونکہ دنیا میں روح حیوانی مرکب ہے۔ روح انسانی کا اور جسم مقر ہے روح حیوانی کا۔

حاصل یہ ہے کہ بالذات عذاب روح انسانی کو ہوتا ہے کیونکہ درحقیقت وہی عقائدِ فاسدہ اور اعمال قبیحہ کی مرتکب ہوتی ہے مگر روح حیوانی چونکہ روح انسانی کے ساتھ جاتی ہے اس لئے روح انسانی کے معذب ہونے سے روح حیوانی بھی معذب ہوتی ہے تو اوّلاً روح انسانی ہے اور تبعیت کی وجہ سے روح حیوانی شریک ہوگی جس طرح دنیا میں جسم بھی شریک تھا اسی طرح سوتے وقت روح حیوانی کا ایک شعبہ روح انسانی کے ساتھ جسم سے نکل جاتا ہے، روح حیوانی تمام نہیں نکلتی، اگر کل نکل جائے تو پھر ہضم کس طرح ہو، سانس کس طرح لی جائے۔

پس روحِ انسانی مرکب ہے خیر و شر سے جیسا کہ اس کے آثار اور کیفیات سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ عناصر سے مرکب نہیں، بلکہ مجرد ہے، یوم الستُ میں تمام ارواح سے فرمایا گیا ہے الست بربکم قالوا بلیٰ حق تعالیٰ نے دنیا میں آنے سے پہلے تمام ارواح کو تعلیم دی اور سب نے حق تعالیٰ کی ربوبیت کی تعلیم کو قبول کیا۔

نفس کا اطلاق بھی دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ کبھی اس سے ذات مراد لی جاتی ہے جو روح انسانی اور حیوانی دونوں کا مجموعہ ہے اور کبھی اس کا اطلاق ایک لطیفہ پر بھی ہوتا ہے۔ یہ نفس عناصر اربعہ سے پیدا ہوتا ہے اور قاعدہ ہے کہ ہر چیز مائل الی الاصل ہوتی ہے خواہشات اور غضب دونوں چیزیں نفس میں پیدا ہوتی ہیں۔

چونکہ روح حیوانی عناصر اربعہ سے پیدا ہوتی ہے اور ہر عنصر کا ایک تقاضہ ہے اس لئے غضب اور بہیمیت کے آثار روح حیوانی میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی شخص میں نار کا مادہ غالب ہوگا تو اس پر قوت غضبیہ کا غلبہ ہوگا اور مائیت کے غلبہ سے قوت شہوانی کا غلبہ ہوگا اور اس کا مقتضی بہیمیت کا غلبہ ہے یعنی زیادہ کھانا پینا بہیمیت ہے۔ لہٰذا اول قلب میں ارادہ ہوتا ہے، پھر حرکت ہوتی ہے اور پھر فعل ہوتا ہے اس طرح روح انسانی آمر ہوئی یعنی وہ قلب کو حکم دیتی ہے، پھر اعضاء کو پھر فعل سرزد ہوتا ہے۔

قلب بھی دو ہیں ایک صنوبری اور ایک حقیقی قلب صنوبری درحقیقت محکوم ہے روح کا اور یہ قلب آدمی کے جسم ہی میں ہے۔ قلب صنوبری مادی اور جسمانی ہے اور قلب حقیقی ایک قطعہ ہے روح کا، اس لئے عذاب کی صورت میں معذب تو سب ہیں لیکن درجہ بدرجہ انسان کا دنیا میں آنے سے مقصد کیا ہے اپنے نفس کے امراض کو معلوم کرکے اصلاح کرنا یا حقائق شناسی۔ ایک شخص مرض کو معلوم نہ کر سکا اور دوا شروع کر دی اور دوسرا مرض کو معلوم کر کے دوا کرتا ہے تو فائدہ کس کو ہوگا؟

اسی وجہ سے قرآن پاک نے اس طرف توجہ دلائی ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون جس علاج کے لئے ہم پیدا کئے گئے ہیں اس مرض کو معلوم کر کے علاج کرنا چاہیے حقائق اشیاء سے ہم کوئی اصلاح نہ کر سکیں گے۔

علم تصوف میں بھی حقائق کے تین شعبے ہیں۔ ریاضت، علم حقائق اور اتصال باللہ
بعض لوگ حقائق کی طرف متوجہ ہوئے تو انکشاف ہوا مگر دور جا پڑے اسی وجہ سے
قرآن پاک نے اختصار کر کے قل الروح من امر ربی کہا اور امر ربی میں حقیقت بتلا دی
لیکن ہماری اصل بیماری اس سے دور نہ ہوگی ہم کو تو اس علاج کی طرف توجہ کرنا ہوگی، جو
نافع مقصود ہو۔

احتیاط اور عقل بھی فکر آخرت کو مقتضی ہے

اگر کسی کھانے کے متعلق اختلاف ہو کہ اس میں زہر ہے کہ نہیں،
اور تم یقین بھی کر و کہ اس میں زہر نہیں تب بھی احتیاط کا تقاضہ ہے کہ اس کو نہ کھاؤ، کیونکہ
اس کے نہ کھانے میں کوئی حرج نہیں، صرف تھوڑی لذت چھوڑنی پڑتی ہے اور مبادا اس
میں زہر ہوا تو موت واقع ہو جائے گی۔

اسی طرح اگر کسی کو آخرت کا یقین نہیں بھی ہے، تب بھی تعلقات کے کم کرنے میں
راحت ہے اور زیادتی میں مصیبت اور پریشانی۔

بابِ ہفتم

قلب کی اخلاق محمودہ سے تزئین

توبہ کا بیان گناہ گار بندہ کی توبہ سے حق تعالیٰ بہت خوش ہوتا ہے۔ حق تعالےٰ فرماتا ہے کہ مسلمانو! تم سب اللہ سے توبہ کرو، بے شک وہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے گناہ کے بعد توبہ کرلی وہ ایسا ہوگیا جیسے گناہ ہی نہیں کیا۔

حق تعالیٰ کو بندہ کی توبہ سے خوشی کا اندازہ لگانے کے لئے مسافر اور اونٹنی والی حدیث کی مثال دیکھنا چاہیئے۔

توبہ کے معنی و مقصد توبہ کے معنی رجوع کرنے اور بُعد سے قریب کی جانب لوٹ آنے کے ہیں، مگر اس کے لئے بھی ابتدا اور انتہا ہے، ابتدا تو یہ ہے کہ قلب پر نورِ معرفت کی شعاعیں پھیل جائیں اور دل کو اس بات کی پوری آگاہی حاصل ہوجائے کہ گناہ سمِ قاتل اور تباہ کن شئی ہے اور پھر خوف و ندامت پیدا ہوکر

گناہ کی تلافی کرنے کی سچی اور خالص رغبت اتنی پیدا ہو جائے کہ جس گناہ میں مبتلا تھا اسکو فوراً چھوڑ دے اور آئندہ کے لئے اس گناہ سے بچنے اور پرہیز کرنے کا مصمم قصد کرے اور ساتھ ہی جہاں تک ہو سکے گزشتہ تقصیر و کوتاہی کا تدارک کرے جب ماضی، مستقبل اور حال، تینوں زمانوں کے متعلق توبہ کا یہ ثمرہ پیدا ہو جائے گا تو توبہ کا وہ کمال حاصل ہو جائیگا جس کا نام توبہ کی انتہا ہے۔

توبہ کا وجوب ہر بشر اور مومن پر

مسلمانوں کو مخاطب فرمایا گیا ہے کہ:
اے ایمان والو! ۔ تم سب توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

ہر فرد بشر پر عقلاً توبہ کا وجوب اس لئے ہے کہ آدمی چار قسم کی صفات مذمومہ کا حامل ہے۔

اول: حرص و شہوت اور فسق و فجور جو بہائم کی خصلت ہے۔

دوم: غصہ، حسد، بُغض اور بغض و عداوت جو درندگی کی خاصیت ہے۔

سوم: مکر و فریب اور دھوکہ دہی جو شیطانی اخلاق ہیں۔

چہارم: کبر و نخوت تعلّی و تفاخر حُبّ مدح، حب جاہ حکمرانی و سلطنت حکومت نشان، غلبہ اور عزت کی طلب اور یہ سب ربوبیت کی صفات ہیں۔

اپنے اپنے موقعہ پر ان کا غلبہ اور ظہور ضرور ہوتا ہے لہٰذا ہر انسان پر توبہ ضروری ہے۔ تاکہ وہ حد اعتدال میں رہ سکے اور کئے ہوئے گناہوں کی تلافی ہو سکے۔

۱۔ عام لوگوں کی توبہ ظاہر گناہوں سے ہوا کرتی ہے

۲۔ صالحین کی توبہ باطنی گناہوں اور مذموم اخلاق سے

۳۔ متقین کی توبہ شک وشبہ میں مبتلا ہونے سے
۴۔ محبین کی توبہ اس غفلت سے جس نے ذکر الٰہی کو کسی لمحہ بھلا دیا۔
۵۔ عارفین کی توبہ اس مقام سے ہوتی ہے جس پر وہ فائز ہوتے ہیں مگر اس کے اوپر دوسرا مرتبہ ہے جس پر ان کو پہونچنا چاہیئے اور چونکہ حق تعالیٰ کے قرب کے مراتب و مقامات غیر متناہی ہیں اس لئے عارفین کی توبہ کا بھی کوئی منتہیٰ نہیں اور نہ اس کے خاتمہ کا کوئی وقت ہے۔

شرائط توبہ پوری ہو جانے پر اس کی قبولیت میں شک نہیں

انسان کا قلب آئینہ کے مانند ہے جس پر خواہشات نفسانیہ اور حرص وہوا کے باعث غبار جم جاتا ہے یا گناہ کی وجہ سے سیاہی چھا جاتی ہے اور نیک کام جو بمنزلہ نور کے ہیں، اپنی روشنی و چمک دمک سے اس تاریکی کو دور کر کے آئینۂ قلب کی صیقل کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے انسان جب نادم و پشیمان ہو کر حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگا تو ضرور ایسی حالت ہوگی جیسے میلے کپڑے پر صابن لگانے سے ہوتی ہے۔ اگر صابن باقاعدہ لگایا گیا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ میل نہ اترے، اسی طرح اگر دل اخلاص و توبہ کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوا ہے تو ممکن نہیں کہ قلب میں صفائی و انشراح اور تجلیات معرفت کی استعداد و قابلیت پیدا نہ ہو، اگر بعض بزرگوں کو قبولیت توبہ میں شک اور تردد ہے تو وہ صرف اس وجہ سے کہ شرائط توبہ متحقق ہوئیں یا نہیں۔ جیسے کوئی شخص مسہل استعمال کرے پھر بھی اس کو دستوں کے آنے میں شک ہو تو یہ شک دوا کے دست آور ہونے میں نہیں بلکہ اسمیں شک ہے کہ مسہل کی شرائط پوری طرح ادا ہو بھی گئیں یا نہیں، یعنی دوا کے اجزاء پوری تعداد میں تھے، یا کم و بیش اور اسہال موسم و وقت کے مناسب بھی تھا یا نہیں تھا۔ اور اگر

ان تمام امور میں اطمینان ہو تو پھر دستوں کے آنے اور غلیظ مادہ کے خارج ہو جانے میں بھی شک نہ ہوگا اسی طرح اگر توبہ کے تمام شرائط جمع ہو جانے کا پورا یقین ہو جائے تو پھر اس کی قبولیت میں شک ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

مرضِ غفلت بدنی امراض سے بڑھا ہوا ہے

غفلت کا باطنی مرض بخار لرزہ اور پھوڑے پھنسی وغیرہ جسم کے ظاہری امراض سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے' اس کی چند وجوہ ہیں۔

۱۔ بدن کے امراض نظر آتے ہیں اور غفلت کا اندرونی مرض نظر نہیں آتا۔

۲۔ غفلت کے باطنی مرض کا انجام انسان نے دیکھا نہیں بخلاف بدنی امراض کے کہ ان کا نتیجہ اس کے تجربہ میں آتا ہے۔

۳۔ باطنی مرض کے طبیب مفقود ہو گئے' قلبی امراض کے اطباء علماء شریعت اور عقلاء زمانہ تھے اور اب ان میں بہت سے خود باطنی بیماریوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ جب ان کو اپنے ہی علاج کی فکر نہیں تو وہ دوسروں کا علاج کیا کریں گے۔؟

طبیب خود مریض بن گئے اور علماء طالبانِ دنیا بن گئے' سب سے زیادہ مہلک مرض دنیا اور مال کی محبت ہے اور اس زمانہ پر آشوب میں سب سے زیادہ اس مرض کے اندر علماء ہی گرفتار نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ دوسروں کو دنیا کی محبت سے روکنے اور منع کرنے کی ان کو جرأت نہیں ہوتی بلکہ اپنی رسوائی کے اندیشے سے وہ یہ بھی نہیں ظاہر کر سکتے کہ دنیا کی محبت بُری چیز ہے اور یہ باطنی امراض میں سے ایسا مہلک مرض ہے جس سے جاں بری دشوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرض لاعلاج ہو گیا' جب طاعون' یا وبائی امراض عام طور پر پھیل جائیں اور دوا کا نشان دینے بھی نہ مل سکے اور طبیب خود اسی مرض کے مریض ہوں تو بھلا اس

سے نجات کیونکر حاصل ہوگی۔ سب سے زیادہ مصیبت یہ ہے کہ ان روحانی طبیبوں یعنی علماء کی دیکھا دیکھی عوام الناس کو محبت دنیا کی رغبت بڑھ گئی اور پرہیز یا دوا کی طرف توجہ کرنے کی کوئی سبیل بھی باقی نہیں رہی کیونکہ ان ہی حضرات کی تقلید کی جاتی ہے اور عام آدمی انہی کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہیں جب انہی کو محبت دنیا میں گرفتار دیکھیں گے تو پھر اس کو اچھی بات سمجھ کر کیوں نہ اقتدا کریں گے تو پھر اصلاح کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔؟ افسوس کہ جن کو طبیب بنا کر دنیا میں بھیجا گیا تھا وہ خود گمراہ ہو کر دوسروں کا راستہ پانے کے درپے ہو گئے گویا یہ شیریں چشمہ کے دہانے پر پتھر بن کر اڑ گئے کہ نہ خود پانی پئیں اور نہ دوسروں کو پینے دیں۔ اے کاش! دہانے سے یہ پتھر سرک جائے اگر وہ خود نا قابل ہیں تو چشمہ کا دہانہ کیوں روکے ہوئے ہیں، ہٹ جائیں تاکہ دوسرے تشنہ کام تو سیراب ہو جائیں۔

گناہ پر اصرار ہونے اور توبہ نہ کرنے کی وجوہ اور ان کا علاج

۱۔ گناہ پر جو سزا حق تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے وہ گناہ کے کرتے ہی فوراً نہیں ملا کرتی، لہٰذا اس کی خشیت دل میں نہیں ہوتی اور گناہ پر اصرار ہونے لگتا ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ تم سوچو اور غور کرو جو چیز ایک نہ ایک دن ضرور آنے والی ہے۔ وہ نہایت قریب ہے، اس سے غفلت حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ ——— سوچو کہ آئندہ کے افلاس کے اندیشہ سے معاش کے حاصل کرنے کی فکر میں کیسے کیسے دور دراز کے سفر اور مصائب برداشت کرتے ہو مگر آخرت کی پائیدار زندگی کا ذرا بھی فکر نہیں ہوتا جتنی دنیا کی ہے حالانکہ یہ بہت جلد ختم ہو جانے والی اور ناپائیدار زندگی ہے۔

۲۔ نفس کو اپنی مرغوب خواہشوں اور لذتوں میں مزہ آ رہا ہے لہٰذا ان کا چھوڑنا اس کو

گراں گزرتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ سوچو اور فکر کرو کہ نفس ناپائیدار دنیا میں جب لذت اور خواہش کو چھوڑنا گوارا نہیں کرسکتا تو آخرت کی پائیدار تکلیف اور عذاب خداوندی کس طرح برداشت کرے گا۔ کیا خدا اور رسول ﷺ کے وعدہ و وعید کا یقین نہیں ہے، طبیب اور ڈاکٹر اگر کسی چیز کو مضر صحت بتا دیتا ہے تو ہم اس پر کاربند ہوتے ہیں مگر اللہ اور رسول ﷺ نے جس چیز کو مضر زیاں بتادیا ہے، اس سے غفلت ہے۔!

۳۔ نفس نے کاہلی کا سبق پڑھا دیا اور یہ شوشہ چھوڑ دیا ہے کہ توبہ کی ایسی جلدی ہی کیا ہے، آج نہیں کل کرلینگے غرض اسی طرح دن پر دن گزرتے رہتے ہیں اور توبہ کی توفیق نہیں ہوتی اور بالآخر موت آجاتی ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ سوچو موت کا وقت معلوم نہیں، کب آجائے۔ کیا معلوم کہ زندگی کا یہی سال آخری سال ہو اور یہی مہینہ آخری مہینہ ہو یہی ہفتہ اور یہی دن بلکہ یہی ساعت آخری ساعت ہو۔

نیز یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ جب نفس کو لذت کا چھوڑنا آج دشوار ہو رہا ہے تو کل جبکہ شہوت کی لذت اور مضبوط ہو جائے گی کیونکر چھوٹ سکے گی۔ جس درخت کو آج نہیں اکھاڑ سکتے ہو اس کو آئندہ سال کس طرح اکھاڑوگے جبکہ جڑیں درخت کی زیادہ مضبوط ہو جائینگی۔ اور تمھاری قوت مضمحل اور کمزور ہو جائے گی۔

۴۔ نفس نے فریب اور دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے کہ حق تعالیٰ غفور و رحیم ہے اس کو ہمارے گناہوں کی کیا پرواہ، وہ سب معاف کردے گا۔ سوچو اور غور کرو کہ حق تعالیٰ کا وعدہ جس طرح سچا ہے اسی طرح وعید بھی سچی ہے جہاں پر جنت اور مغفرت کا وعدہ ہے، وہیں پر غفلت اور بدعملی پر جہنم اور عذاب کی وعید بھی تو ہے۔

معاذ اللہ اگر قیامت کے ہونے اور معاملۂ آخرت کے پیش آنے میں شک و شبہ ہو

اس کا علاج یہ ہے کہ اپنے ایمان اور اعتقاد کی درستی کی فکر کرنا چاہیئے اور بس۔

صغیرہ گناہ پر اصرار کبیرہ سے زیادہ مضر ہے

یوں تو تمام گناہوں سے توبہ کرنا ضروری ہے۔ مگر کبیرہ گناہوں سے توبہ کرنا نہایت ضروری ہے اور چونکہ صغیرہ گنا بھی اصرار کرنے سے کبیرہ ہو جاتا ہے بلکہ صغیرہ گناہ جب بار بار کیا جاتا ہے تو قلب کو زیادہ سیاہ کر دیتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سخت پتھر پر پانی کا ایک ایک قطرہ متواتر ٹپکنا اور کہیں ایکبارگی موسلادھار مینہ کا برسنا کہ ایک قطرہ باوجودیکہ حقیر اور بہت ہی بے وقعت چیز ہے مگر بار بار پڑنے کی وجہ سے ایک نہ ایک دن پتھر میں سوراخ کر دے گا۔ برخلاف موسلادھار بارش کے کہ اگرچہ کئی لاکھ قطروں کا مجموعہ ہے مگر ایکبارگی برسنے سے اس کا وہ اثر نہ ہوگا جو ایک قطرہ نے آہستہ آہستہ کر دکھایا تھا۔ اسی طرح چھوٹا گناہ آہستہ آہستہ قلب پر جو اثر کرتا رہتا ہے وہ کبیرہ گناہ کے ایکبارگی اثر کی بہ نسبت بہت ہی اندیشناک ہوتا ہے اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

۱۔ صغیرہ گناہ کی اہمیت ذہن میں نہیں ہوتی اور اس کو معمولی گناہ سمجھ کر بے پرواہی کی جاتی ہے۔

۲۔ صغیرہ گناہ کو بسا اوقات انسان نعمت سمجھتا ہے اور خوش ہوتا ہے چنانچہ لوگوں کو اکثر کہتے سنا گیا ہے کہ دیکھا میں نے اس کو کیا جواب دیا کیا بدلہ لیا، کیسی آبروریزی کی، کیا دھوکہ دیا اور ظاہر ہے کہ ان گناہوں پر خوش ہونا زیادہ مضر اور قلب کو زیادہ سیاہ کرنے والا ہے۔

۳۔ گنہگار آدمی حق تعالیٰ کی پردہ پوشی کو اپنی کرامت اور بزرگی سمجھنے لگتا ہے۔ یعنی یہ خیال کرتا ہے کہ میں خدا کے نزدیک صاحب مرتبہ شخص ہوں لہٰذا میرے گناہ ظاہر نہیں ہوتے

اور یہ خبر نہیں کہ خدا کی طرف سے ڈھیل دی جا رہی ہے تاکہ گناہ زیادہ ہو جائیں تو یکبارگی پکڑا جائے اور اسفل السافلین میں جھونک دیا جائے۔

۴۔ صغیرہ گناہ کو معمولی سمجھ کر لوگوں میں ظاہر کرتا پھرتا ہے، حالانکہ حدیث میں آیا ہے کہ تمام گناہ گار بخشدیئے جائیں گے مگر گناہوں کا اعلان و افشار کرنے والا نہ بخشا جائے گا۔

۵۔ اگر کسی عالم یا صوفی سے کوئی صغیرہ گناہ ہوتا ہے تو اس کا اور بھی زیادہ برا اثر پڑتا ہے کہ عام لوگ اس کو دیکھ کر اس گناہ میں بے باکانہ مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح گناہ کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے گویا یہ صغیرہ گناہ اتنا دراز ہو جاتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ باقی رہنے والا گناہ ختم ہو جانے والے گناہ سے بدتر ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس گناہ کا بقا اس کے صغیرہ ہونے کی وجہ سے ہوا۔

خوف کا بیان

ہر فرد بشر پر توبہ ضروری ہے اور توبہ اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ دل میں خدا کا خوف ہو اس لئے خوف کی فضیلت اور اس کی ضرورت کو سمجھنا چاہیئے۔ خوف خدا تمام نیک کاموں میں رغبت کا اور تمام گناہوں سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ خوف کرنے والے بندے کے حق میں حق تعالیٰ نے ہدایت، رحمت، اور رضا کی محمود خصلتیں جمع فرمائی ہیں جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اس سے ہر شئی ڈرنے لگتی ہے۔ ارشاد ہے کسی بندہ کو دو خوف نصیب نہ ہوں گے یعنی جو بندہ دنیا میں خدا کا خوف رکھے گا، وہ آخرت میں بے خوف ہوگا۔ اور جو دنیا میں خدا سے نڈر رہا اس کو آخرت میں امن و اطمینان نصیب نہ ہوگا۔ خوف کے حقیقی معنی یہ ہیں کہ کسی آنے والی تکلیف کے اندیشہ سے دل دکھے اور سوزش پیدا ہو، اور ظاہر ہے کہ جب تک حق تعالیٰ کی صفات جلالیہ کی معرفت حاصل نہ ہوگی خوف پیدا نہ ہوگا اور جب یہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے گا کہ خدائے تعالیٰ پر چھوٹی

سے چھوٹی اور ہر بڑی سے بڑی چیز پر قادر ہے کہ دم بھر میں جو چاہے کرے اور مخلوق میں کوئی شخص چوں وچرا بھی نہیں کر سکتا تو اس وقت خوف اور خشیت پیدا ہو جائے گا پس اگر خوف خدا پیدا کرنا چاہتے ہو تو حق تعالیٰ کے جلال اور اس کی بے نیازی پر نظر کرو اور نفس سے کہو کہ اے نفس معلوم نہیں کہ تیرے حق میں کیا حکم صادر ہو اور تیرا خاتمہ کس حال پر ہو ممکن ہے کہ تو جنت میں جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ تیرے لئے جہنم کی دائمی سزا تجویز ہو مخفی انجام سے وہی غافل اور بے خوف ہو سکتا ہے جس کی نظر حق تعالیٰ کی صفات جلالیہ پر نہ ہو اور اس کو حقیقی معرفت حاصل نہ ہو، کاملین اور اہل معرفت کو کس قدر خوف اور خشیت تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، جب کبھی جبرئیل میرے پاس وحی لیکر آئے تو خدائے جبار و قہار کے خوف سے لرزتے اور کانپتے ہوئے آئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قلب نماز کی حالت میں خوف کے سبب ایسا جوش مارتا تھا جیسے ہانڈی کھولتی ہے اور اس جوش کی آواز ایک میل سے سنائی دیتی تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن کامل سربسجود گریہ وزاری کرتے رہے، یہاں تک کہ آنسوؤں سے آس پاس کی زمین پر گھاس پیدا ہو گئی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک پرند کو مخاطب بنا کر فرمایا کہ اے کاش میں تجھ سا پرند ہوتا تاکہ شریعت اور احکام خداوندی کا مکلف نہ ہوتا یا کاش میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کاش میں درخت ہوتا کہ کاٹ دیا جاتا۔

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کاش میں بھولی بسری ہو جاتی۔

غرض جن حضرات کو حق تعالیٰ کی بے نیازی اور معرفت حاصل ہے وہ بے خوف

اور نڈر نہیں رہ سکتے۔ نڈر ہونا انھیں غفلت شعار ارباب دنیا کا شیوہ ہے جن کی نہ اپنے خاتمہ پر نظر ہے نہ اصلاح آخرت کی جانب توجہ یہ غفلت کے پتلے اس بچے کے مثل ہیں جس کو زہریلے سانپ سے بھی ڈر نہیں لگتا۔ مگر بچہ دوسرے کے سمجھائے سمجھ تو جاتا ہے کیا بہتر ہو کہ جس طرح ناسمجھ بچہ اپنے سمجھدار باپ کو سانپ سے ڈرتا اور بچتا ہوا دیکھ کر خود بھی بھاگتا ہے اسی طرح ہم غافل و بے خبر مسلمان بھی اپنے محسن و مربی روحانی اور خاصان خدا کی حالتِ خوف کے مشاہدہ سے عبرت حاصل کریں۔

خوف خدا کی زیادتی بھی مذموم و مضر ہے

خوف درحقیقت ایک چابک ہے جو انسان کو سعادت ابدی کی طرف لیجاتا ہے لہٰذا اس حد تک پسندیدہ ہے جس حد تک کہ نیکوکاری کا آلہ بنے اور اتنا زیادہ نہ ہو کہ بیکار بنادے اور مایوسی کی حد تک پہونچا کر اعمال چھڑادے جو خوف ناامیدی کی حد کو پہنچادے وہ شرعاً مذموم ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایمان خوف اور امید کے درمیان ہے۔ پس خوف کے ساتھ رجاء اور امید بھی ضروری ہے۔ گنہگار پر خوف کا غلبہ رہنا چاہیئے۔ نیکوکار پر دونوں چیزیں مساوی ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا اللہ تعالیٰ کا اگر حکم صادر ہو کہ ساری مخلوق میں سے صرف ایک شخص جنت میں جائیگا تو میں امید کرتا ہوں کہ وہ شخص میں ہی ہوں گا اور اگر فرمان صادر ہو کہ دوزخ میں صرف ایک ہی شخص داخل ہوگا تو مجھے خوف ہے کہ وہ شخص میں ہی نہ ہوں۔ یہ حالت مساوات کی ہے جس میں خوف و رجاء دونوں پلڑے برابر ہیں۔

جوانی میں خوف اور بڑھاپے میں رجاء کا غلبہ مفید ہے

جوانی کے زمانے میں شہوات

نفسانیہ کے توڑنے کے لیے خوف کے کوڑے کی ضرورت ہے اور بڑھاپے اور ضعف کے زمانے میں اگر خوف غالب ہوا تو رہے سہے ہاتھ پیر بھی پھول جائیں گے اور جو کچھ کر سکتا ہے وہ بھی ہو جائیگا حدیث میں ہے کہ مسلمان کو مرتے وقت اپنے خدا کے ساتھ نیک گمان کرنا چاہیئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ یہ جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ کچھ تو آدمی کے ساتھ اعمالِ خیر کا ذخیرہ موجود ہو۔

کاشت کار کو غلہ کی امید ہو سکتی ہے جبکہ تخم ریزی وغیرہ کا کام کیا ہو ورنہ اس کو رجاء اور امید نہ کہا جائے گا بلکہ ہوس کہیں گے۔

رجا اور ہوس میں فرق

ہوس شیطانی دھوکہ ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو بندے ایمان لائے اور ہجرت کر گئے اور فی سبیل اللہ جہاد کیا، وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ رجاء وامید سعی وکوشش کے بعد ہوا کرتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عتابِ الٰہی سے ڈر کر معصیتوں اور نافرمانیوں سے رکنا چاہیئے۔ اور رحمتِ الٰہی کا امیدوار بنکر نیکیوں میں رغبت ہونی چاہیئے۔ پس خوف کو اس وقت معتبر سمجھو جبکہ وہ تم کو معصیت سے روکے اور گناہ کی جرأت نہ ہونے دے اور اگر یہ حاصل نہ ہو تو اس کا نام خوف نہیں بلکہ عورتوں جیسی رقت قلبی اور وہم وخیال ہے جس کا کچھ اعتبار نہیں خوف جب کمال پر پہونچتا ہے تو دنیا سے بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے جس کا نام زھد ہے۔

زھد علم کا ثمرہ اور شرح صدر کی علامت ہے

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ (اے محمدؐ) اس مال وجاہ کی جانب نظر نہ اٹھاؤ جو ہم نے کافروں کو دنیا کی تازگی کی جنس سے دے رکھا ہے کہ اس سے مقصود ان کو فتنہ میں ڈالے رکھنا ہے اور تمھارے پروردگار ہی کی عطا بہتر اور زیادہ پائیدار ہے نیز قارون کے

کے واقعہ میں ہے کہ وہ بن سنور کر ایک شان اور ٹھاٹھ کے ساتھ جلوس میں نکلا اور بعض لوگوں کو یہ تزک و احتشام دیکھ کر حرص ہوئی تو جن لوگوں کو علم مرحمت ہوا تھا وہ کہنے لگے کہ افسوس تم اس ناپائیدار چیز کی حرص کرتے ہو، دیکھو حق تعالیٰ کا ثواب سب سے بہتر چیز ہے۔ اس قصہ سے معلوم ہوا کہ زہد در حقیقت علم کا ثمرہ ہے۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص صبح اٹھتے ہی دنیا کے غم میں مبتلا ہو جاتا ہے حق تعالیٰ اس کا دل پریشان کر دیتا ہے اور ملتا وہی ہے جو اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے اور جو شخص صبح اٹھتے ہی آخرت کی فکر میں لگ جاتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے قلب کو مطمئن رکھتا اور اس کی دنیا کی خود حفاظت و کفالت فرماتا ہے اس کا دل غنی کر دیتا ہے۔ اور اسے دنیا مرحمت فرماتا ہے کہ منہ پھر جاتا ہے اور دنیا اس کے پیچھے بھاگی چلی جاتی ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے لئے شرح صدر کر دیتا ہے۔ اس کی تفسیر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ اس کے قلب میں وہ نور داخل کر دیتا ہے جس سے اس کا سینہ منشرح ہو جاتا ہے۔

صحابہ رضی نے دریافت کیا یا رسول اللہ صلعم! اس کی شناخت کیا ہے؟ آپ صلعم نے فرمایا کہ دنیا سے بے رغبتی اور دین کی جانب توجہ اور موت سے پہلے موت کا انتظام کرنا، شرح صدر کی خاص پہچان ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جس کو حق تعالیٰ عابد و زاہد بناتا ہے اس کے قلب میں حکمت القاء فرماتا ہے۔ اور دنیا کی بیماری و علاج سے آگاہ کر دیتا اور اس جہان فانی سے باہر نکال کر دار السلام میں پہونچا دیتا ہے۔ آپ صلعم نے صحابہ رضی سے فرمایا کہ حق تعالیٰ سے حیا کرو! صحابہ رضی نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم حیا تو کرتے ہیں۔ آپ صلعم نے فرمایا کہ جہاں رہنا نہیں ہے،

وہاں مکانات بناتے ہو اور جو کھا نہیں سکتے وہ جمع کرتے ہو۔ یاد رکھو کہ بندہ کا ایمان اس وقت کامل ہوتا ہے جبکہ گوشہ گمنامی میں پڑے رہنے کو شہرت سے زیادہ پسند کرے اور دنیا کی ہر چیز کی قلت کو اس کی کثرت سے زیادہ محبوب سمجھے جب انسان دنیا میں زاہد بنتا ہے تب حق تعالیٰ اسکو اپنا محبوب بنالیتا ہے اور جب وہ خدا کا محبوب بن جاتا ہے تو مخلوق کی نظروں میں بھی محبوب ہو جاتا ہے۔

زہد کی حقیقت اور اس کا ثمرہ و اثر

حقیقی زہد یہ ہے کہ انسان دنیا کے مال و متاع کی جانب التفات نہ کرے اور حصول کی طاقت کے باوجود اس کی جانب متوجہ نہ ہو اور زہد کی اصل وہ نور اور علم ہے جو اللہ کی طرف سے بندہ کے قلب میں ڈال دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سینہ کھل جاتا ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کے جملہ ساز و سامان مکھی کے پَر سے بھی زیادہ حقیر ہیں اور آخرت ہی بہتر و پائیدار ہے جس وقت یہ نور حاصل ہوتا ہے تو اس حقیر دنیا کی آخرت کے مقابلے میں ایک پھٹے پرانے چیتھڑے کی ہوا کرتی ہے۔

زہد کا ثمرہ یہ ہے کہ بقدرِ ضرورت و کفایت دنیا پر قناعت حاصل ہو جائے پس زاہد اسی مقدار پر کفایت کرتا ہے جتنا کسی مسافر کو سفر کا توشہ اپنے پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے اور وہ ضروری سامان جس کی ہر شخص کو احتیاج ہے۔ طعام، لباس اور آثاث البیت ہر ایک میں زہد کے مراتب اور مدارج ہیں جن کی تفصیل ہم بیان کرتے ہیں۔

مدت کے اعتبار سے زہد کے مراتب و مدارج

طعام کی ضرورت پوری کرنے میں زہد تین اعتبار سے ہوتا ہے۔ مدت، مقدار، جنس۔ مدت کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ زہد کا تو یہ ہے کہ صرف ایک

وقت کے کھانے پر قناعت کرے کہ اگر صبح کو بھوک رفع ہو جائے تو شام کے لئے کچھ پاس نہ ہو اور شام کو پیٹ بھر جائے تو صبح کے لئے کچھ ذخیرہ نہ ہو۔ اوسط درجہ یہ ہے کہ ایک ماہ یا چالیس دن کی خوراک مہیا ہو اور اس سے زیادہ کی پرواہ نہ ہو۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ صرف سال بھر کا ذخیرہ جمع کر لیا جائے۔

مقدار کے اعتبار سے زہد کے مراتب

طعام میں مقدار کے اعتبار سے ادنیٰ درجہ کی مقدار جس کو زہد کا اعلیٰ درجہ کہنا چاہیئے نصف رطل یعنی پاؤ سیر اناج ہے اور اوسط درجہ کی مقدار آدھا سیر اور اعلیٰ مقدار جو زہد کا ادنیٰ درجہ ہے سیر بھر غلہ ہے۔ پس جس نے اس سے زیادہ مقدار کھائی اس نے زہد کے خلاف کیا۔

جنس کے اعتبار سے زہد کے مراتب

اعلیٰ درجہ کا زہد اس کھانے پر اکتفا کرتا ہے جس میں غذائیت پائی جائے۔ اگرچہ اناج کی بھوسی ہی کیوں نہ ہو، اوسط درجہ جو کی روٹی ہے اور ادنیٰ درجہ گیہوں کے بے چھنے آٹے کی روٹی کا کھانا اور اگر آٹا چھان لیا تو زہد نہیں بلکہ تنعم و تلذذ ہے۔ اور ترکاری میں اول درجہ کی ترکاری جو زہد کا اعلیٰ درجہ ہے سرکہ اور سبزی اور نمک کا استعمال ہے اور اوسط درجہ چکنائی کا استعمال اور اعلیٰ درجہ کی ترکاری جو زہد کے سب سے نیچے کا درجہ ہے گوشت کھانا ہے۔ بشرطیکہ ہفتہ میں صرف ایک دو مرتبہ ہو اور ہمیشہ گوشت کھانے کی عادت ہو گئی تو زہد سے بالکل باہر ہو گیا۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ چالیس چالیس دن گزر جاتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کدہ میں آگ نہیں سلگتی تھی اور جب سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے مسلسل کبھی تین دن گیہوں کی روٹی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

لباس کے متعلق زہد کے درجے

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ صرف اتنے کپڑے پر قناعت کرے جن سے ستر ڈھنک جائے اور سردی گرمی رفع ہو سکے اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کسی کھردرے کپڑے کا کرتہ و پاجامہ اور رومال رکھے، پہنے ہوئے کپڑے کو دھونے کی ضرورت پیش آئے تو رومال باندھ کر دھولے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک چادر اور ایک موٹا کرتہ نکال کر مجھ کو دکھلایا اور فرمایا کہ ان دو کپڑوں میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا ہے۔ ایک مرتبہ آپؐ نے ایک نیا جوڑا نعلین کا پہنا اچھا معلوم ہوا اس کو نکالکر فوراً ایک مسکین کو دیدیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی قمیص میں بارہ پیوند لگے تھے جن میں سے بعض چمڑے کے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مقتدا پر ضروری ہے کہ ادنیٰ لوگوں کا سا لباس پہنے تاکہ امرا اور اہل مال اس کا اقتدا کریں۔ اور فقرا و نادار اپنے فقر کو بہ نظرِ حقارت نہ دیکھیں۔

مکان کے متعلق زہد کے درجے

اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ مسافر خانہ یا مسجد کے حجرہ میں زندگی گذار دے اور اوسط درجہ یہ ہے کہ کوئی خاص جگہ تجویز کرے یعنی بقدر ضرورت ایک حجرہ خریدے یا کرایہ پر لے لے۔ بشرطیکہ حاجت سے زیادہ اس میں وسعت نہ ہو اور نہ اس کی اونچی اونچی دیواریں ہوں نہ قلعی چونہ ہو، کیونکہ استرکاری کے مکانات میں رہائش زہد سے خارج ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں ہم مکان میں چونہ کی استرکاری کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا میاں وقت تو اس سے پہلے پورا ہو جانیوالا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے رہائش کے لیے پھونس کا ایک جھونپڑا بنا رکھا تھا، اس میں ایام گزاری فرماتے تھے۔ عرض کیا گیا، یا نبی اللہ ایک گھر بنا لیجئے۔ فرمایا مرنے کے واسطے تو یہ پھونس کا گھر بھی کافی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص ضرورت سے زیادہ مکان بنائے گا قیامت کے دن اس کو تکلیف دی جائے گی کہ اس کو سر پر اٹھائے اب ضرورت کو خود سمجھ لیا جائے جس حد تک سردی گرمی رفع ہو ضرورت ہے اور زیادہ وسعت وسجاوٹ زہد کے خلاف ہے۔

اثاث البیت کے متعلق زہد

اس کے بھی چند درجے ہیں:

ادنیٰ درجہ کا سامان جس کو زہد کا اعلیٰ درجہ کہنا چاہیئے وہ ہے جو حضرت عیسٰے علیہ السلام کا مال تھا کہ ایک کنگھا اور ایک آب خورہ، بس یہی اثاث البیت اور یہی سفر وحضر کا سامان تھا۔ ایک بار چلے جا رہے تھے کہ ایک شخص نظر پڑا، جو انگلیوں سے کنگھے کا کام لے کر اپنے بال درست کر رہا تھا، حضرت روح اللہ علیہ السلام نے کنگھا پھینک دیا اور فرمایا کہ یہ تو ضرورت سے زیادہ چیز نکلی اب آب خورہ رہ گیا اور اس کو لیکر آگے چلے تو ایک شخص کو دیکھا کہ ہاتھ کے چلو سے پانی پی رہا ہے اس وقت آب خورہ پھینک دیا اور فرمایا خدا کے عطا کئے ہوئے بدن ہی کے عضو سے جو کام نکل آئے، اس کے لئے دوسرا انتظام کرنا فضول ہے۔

اوسط درجہ یہ ہے کہ معمولی برتن رکھے اور اس میں اس کا لحاظ رکھے کہ ایک برتن سے کئی کئی کام نکال لے۔

شہر حمص کے حاکم حضرت عمر بن سعدؓ سے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے گھر میں دنیا کی ضرورتوں کے رفع کرنے کے لئے کیا کیا سامان ہے۔؟

جواب دیا کہ ایک لاٹھی ہے اس سے تکیہ لگاتا ہوں اور پتے جھاڑتا ہوں، سانپ بچھو وغیرہ مارتا ہوں اور ایک تھیلہ ہے جس میں کھانا رکھ لیتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں کھانا رکھ کر کھالیتا ہوں اور اسی سے بوقت ضرورت کپڑے وغیرہ دھولیتا ہوں اور ایک برتن ہے کہ جس میں اتنا پانی آجاتا ہے جو پینے اور وضو کرنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ بس یہ چار عدد سامان میرے پاس موجود ہیں اور ساری ضرورتیں الٹ پھیر کر ان ہی سے پوری ہو جاتی ہیں۔

حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ سچ کہتے ہو اور چپ ہو گئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر مبارک صرف ایک تکیہ جس میں گھاس بھری تھی اسکے علاوہ صرف ایک کمبل تھا۔

زہد کے درجے

زہد کے چند درجے ہیں:

ایک یہ کہ نفس اگرچہ دنیا کی طرف مائل ہو مگر اس کو جبراً بے التفات بنایا جائے اور دنیا حاصل کرنے سے زبردستی روکا جائے اس حالت کو زہد کہنا تو ٹھیک نہیں ہے البتہ تزہد کہا جائے اور زہد کی ابتداء سمجھا جائے تو مناسب ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ نفس دنیا سے اتنا متنفر ہو کہ اس کی طرف مائل ہی نہ ہو اور سمجھ جائے کہ دنیا اور آخرت کی نعمتوں کا یکجا ہو جانا چونکہ ناممکن ہے اس لئے آخرت کی لذتوں کے حاصل کرنے میں دنیا کے مال و متاع پر اس طرح خاک ڈال دینا چاہیئے جس طرح کسی بیش بہا جوہر کے خریدنے میں چند روپے خرچ کر دیئے جائیں اور اس میں مطلق دریغ نہیں ہوتا بلکہ روپیہ دے کر اس چیز کے لینے میں خوشی ہوتی ہے۔ ایسے ہی دنیا کا ساز و سامان چھوڑ کر بڑی مسرت کے ساتھ آخرت کی نعمتیں حاصل کر لی جائیں۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ دنیا کے مال و متاع کا عدم و وجود برابر ہو جائے اور یہ خیال رہے کہ

جو کچھ بھی دنیا میں ہے وہ حق تعالیٰ کے بے شمار خزانوں کے بحر زخار اور دریائے ناپیداکنار کا ایک قطرہ ہے لہٰذا اگر مل جائے تو کچھ مسرت نہیں اور اگر نہ ملے یا آیا ہوا ہاتھ سے چلا جائے تو کچھ حسرت نہیں۔ اس درجہ میں نفس نہ تو دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ اس سے متنفر اور یہی زہد کے کمال کا درجہ ہے کیونکہ تنفر بھی ایک قسم کی توجہ اور اس شئے کے باوقعت ہونے کی علامت ہے جس شئے کی وقعت دل سے نکل جایا کرتی ہے اس کی دونوں جانب یعنے تنفر اور توجہ برابر ہوجایا کرتے ہیں۔

زہد سے بھی زہد

دنیا کی جانب سے بے التفاتی کو بھی وقعت کی نظر سے نہ دیکھے بلکہ یوں سمجھے کہ دنیا کوئی چیز بھی ہے کہ جس کا چھوڑنا ہمت اور بہادری سمجھا جائے اور اسے اہمیت دی جائے۔ اس کی تو اہل بصیرت کے نزدیک اتنی بھی قدر نہیں جتنی کسی بڑے بادشاہ کے نزدیک ایک پیسہ کی ہوتی ہے۔ اس بے حقیقت دنیا کو چھوڑنا اور یہ سمجھنا کہ ہم نے کچھ چھوڑ دیا اس میں اس کی حیثیت کو اور بڑھانا ہے اس کی تو ایسی مثال سمجھو جیسے کوئی شخص شاہی دربار میں داخل ہونا چاہے اور اُسے دروازہ پر بیٹھا ہوا کتا داخلہ سے روک رہا ہو۔ پس یہ شخص اس کے سامنے روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دے تاکہ کتا اس کے کھانے میں لگ جائے اور یہ شاہی دربار میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح شیطان حق تعالیٰ کے دروازہ کے سامنے گویا کتا ہے جو سالک کو مطلوب تک پہونچنے سے روک رہا ہے اور ساری دنیا روٹی کے ایک ٹکڑے سے بھی زیادہ بے وقعت ہے جس کو اس کے سامنے ڈال کر سالک نے اپنے مطلوب تک پہونچنے کا راستہ صاف کیا ہے۔ پس شاہی دربار کی حاضری کا اعزاز حاصل کرنے کے لئے جو کتے کو روٹی کا ٹکڑا ڈالا گیا ہے اس کے ذہن میں نہ وقعت ہوگی اور نہ وہ قابلِ تذکرہ، یہی حال دنیا دوں کا ہے۔

زھد کے اسباب

زھد کے متعدد اسباب ہیں:

۱۔ کبھی تو خوف اور عذابِ خداوندی کا اندیشہ زھد کا سبب بن جاتا ہے اس کو خائفین کا زھد کہتے ہیں اور یہ سالکین طریقت کے نزدیک ادنیٰ درجہ ہے۔

۲۔ کبھی آخرت کی نعمتوں اور لذتوں کی رغبت زھد کا باعث ہو جاتی ہے اور اس کو راجین کا زھد کہتے ہیں اور یہ درجہ پہلے درجہ سے بڑھا ہوا ہے کہ رجا یعنی امید چاہتی ہے محبت کو اور محبت کی فضیلت تم کو معلوم ہو چکی ہے۔

۳۔ اور سب میں اعلیٰ یہ ہے کہ تمام ماسوا اللہ کی طرف بے توجہی اور غیر اللہ کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دینا زھد کا باعث ہو اس کو تحقیقی زہد کہتے ہیں کہ پہلے دو درجوں کے زہد تو ایسے ہیں جیسے کسی نافع سودے کی خرید و فروخت ہوتی ہے کہ ایک حقیر چیز کو اس لئے چھوڑ دیا تاکہ تکلیف دینے والی مصیبت اس کی وجہ سے دفع ہو جائے یا اس سے بدرجہا بہتر اور نافع چیز ہاتھ آجائے۔

جملہ ماسوی اللہ سے بے نیازی اعلیٰ زھد ہے

اس درجہ میں ماسوی اللہ کی جانب التفات کرنے ہی کو فضول سمجھا گیا ہے کہ وہ کوئی چیز ہی نہیں۔ پس اس درجہ میں حق تعالیٰ کے سوا جو چیز بھی ہو خواہ مال ہو یا جاہ ہو یا اور کوئی ایسی شے ہو جس سے عموماً لذت حاصل ہوا کرتی ہے ان سب ہی سے بے نیازی حاصل ہو جاتی ہے۔ بخلاف پہلے درجوں کے کہ ان میں صرف مال سے زھد حاصل ہوتا ہے، جاہ سے نہیں ہوتا اور مال میں بھی بعض انواع سے زہد ہوتا ہے اور بعض سے نہیں ہوتا اور یہی وجہ ان درجوں کے ضعیف ہونے کی ہے۔ کیونکہ انسان کو جاہ کی محبت مال کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ اور جس کی محبت زیادہ ہو اسی سے زھد حاصل ہونا اہتمام و توجہ کے

لائق بھی ہے۔

زھد اور فقر کا فرق

زھد یہ ہے کہ باوجود دنیا حاصل کر سکنے کے دنیا سے ایسا بے التفات ہو جائے کہ دنیا اس کے پیچھے بھاگے اور یہ اس سے دامن چھڑائے اور اگر معاملہ برعکس ہو کہ دنیا کو حاصل کرنا چاہے مگر دنیا اس کے ہاتھ نہ آئے تو اس کو زہد نہیں کہتے بلکہ اس کا نام فقر ہے اور فقر کا درجہ زہد کے برابر نہیں ہاں فقر کو تونگری پر فضیلت ضرور ہے کیونکہ تونگری میں دنیا کی لذتوں سے دل بستگی ہو جاتی ہے۔ اور اس وجہ سے مرتے وقت ان مرغوبات کے چھوڑنے کی حسرت ہوا کرتی ہے اور دنیا گویا جنت اور آخرت گویا قید خانہ معلوم ہوتی ہے۔ برخلاف فقر کے کہ اس حالت میں لذتوں سے اگرچہ جبراً و قہراً باز رکھا گیا ہو تاہم چونکہ کبھی کسی چیز کا ذائقہ اور مزہ منہ کو نہیں لگا۔ لہٰذا مرتے وقت کسی چیز کی محبت میں دل نہ لگے گا بلکہ دنیا کو دار الالم اور تنگدستی کا گھر سمجھے گا۔ اور آخرت آزادی اور خوشی عیش کی جنت معلوم ہوگی۔ پس اس میں شک نہیں کہ فقر بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ اور سعادت اخروی کا ایک مضبوط ذریعہ ہے۔

چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ اپنے نیک بندے کو دنیا سے ایسا بچاتا ہے جیسے تم اپنے عزیز بیمار کو کھانے پینے کا پرہیز کراتے ہو۔

فقر کی فضیلت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت کے فقراء جنت میں امراء سے پانچ سو برس پہلے داخل ہوں گے جس وقت کسی فقیر کو دیکھا کرو تو خوش ہوا اور کہا کرو کہ مرحبا صالحین کے طریقہ والے مرحبا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایکبار عرض کیا کہ بار الٰہی بتلایئے آپ کو کون بندے محبوب ہیں تاکہ میں بھی ان سے محبت کروں۔ ارشاد ہوا کہ وہ فقراء جن کو لوگ پاس بھی نہ کھڑا ہونے

دین۔ یاد رکھو کہ اگر فقیر اپنے حال پر قانع ہو اور طلب مال کا زیادہ حریص نہ ہو تو اس کا درجہ زہد کے قریب ہی قریب ہے۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، مبارک ہو اس کو جسے اسلام کی ہدایت ہوئی اور بقدر کفایت معاش ملی اور وہ اس پر قانع ہوا۔ قانع فقیر خدا کو بہت پسند ہے۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پر وحی نازل ہوتی تھی کہ اے اسمٰعیل! مجھے شکستہ دل لوگوں کے پاس ڈھونڈا کرو۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے دریافت کیا کہ بار الٰہا وہ کون لوگ ہیں۔ ارشاد ہوا کہ صابر فقیر۔ غرض فقر کے ساتھ قناعت اور صبر و رضا بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور، اور اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔

صبر کے معنی اور انسان کے ساتھ اس کا اختصاص!

حق تعالیٰ نے صبر کرنے والے کے لئے اتنی صفات جمع فرمائی ہیں کہ دوسروں کیلئے جمع نہیں فرمائیں۔

چنانچہ ارشاد ہے صبر کیا کرو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کرنے والوں پر ان کے پروردگار کی رحمتیں ہیں اور مہربانی اور وہی راہ یاب ہیں۔ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے شمار دیا جائے گا۔ قرآن مجید میں ستر سے زائد جگہ صبر کا ذکر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: صبر نصف ایمان ہے اور جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے جس شخص کو یہ خصلت مرحمت ہوئی اس کو بڑی سعادت نصیب ہوئی شب بیدار اور صائم الدہر سے اس کا درجہ افضل ہے۔ کیونکہ صبر کے حقیقی معنی ہوائے نفس کے مقابلہ میں خدا کے حکم پر مستقل اور ثابت قدم رہنے کے ہیں اور یہ صرف انسان ہی کو حاصل ہو سکتا ہے اس لئے کہ اس پر دو مخالف لشکر مسلط اور حملہ آور ہیں جن میں ایک خدائی لشکر یعنی فرشتوں اور عقل و شریعت کا لشکر ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ انسان کو اپنے قابو میں لائے اور ہدایت پر قائم رکھیں۔ اور

دوسرا شیطانی لشکر یعنی غیظ و غضب اور نفس کی خواہشات اور اس کے اسباب کا لشکر ہے، جو چاہتا ہے کہ انسان کو اپنے قبضہ میں رکھے اور پابند ہوا و ہوس بنائے انسان کو بالغ ہو کر دونوں میں امتیاز کر کے شیطانی لشکر سے جنگ و جدال کرنا پڑتا ہے۔ پس اگر عقل کا غلبہ ہو اور دین اسلام اور شریعت محمدیہؐ پر استقلال نصیب ہو تو صبر کا مرتبہ اس کو حاصل ہو گیا اور چونکہ بہائم میں صرف شہوات و خواہشات کا مادہ ہے۔ عقل اور دین کا شعور نہیں اور فرشتوں کو صرف قرب خداوندی کی استعداد پیدا کی گئی ہے وہ شہوات نفسانی اور غیظ و غضب سے پاک ہیں۔ ہر وقت تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے ہیں۔ لہٰذا صبر کا مرتبہ ان دونوں میں سے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا اور انسان میں چونکہ دونوں متضاد صفتیں موجود ہیں یعنی خواہشات نفسانیہ اور بھلا بُرا سمجھنے کا شعور اور فطرت سلیمہ بھی موجود ہے۔ لہٰذا ایک مغلوب اور دوسرے کو غالب کرنا جس کا نام صبر ہے۔ انسان ہی کے لئے مخصوص ہے جب یہ دونوں حالتیں اپنا اپنا رنگ جمانا چاہتی ہیں تو اس وقت انسان کو عقل سے کام لینے اور اپنا انجام سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ دین کو غالب رکھ کر مقام صبر پر پہونچے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مریض کو تلخ دوا دی جاتی ہے جسے لذت اور مزہ کا طالب پاس لانا بھی پسند نہیں کرتا اور عقل چاہتی ہے کہ گو اس کی تلخی ناگوار گزرے مگر آنکھیں بند کر کے جبراً قہراً پی جائے تاکہ جلد شفا حاصل ہو۔ پس اگر عقل کو غلبہ ہو گا تو بے شک دوا کی تلخی پر صبر کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر دینی معاملہ میں عقل اور فطرت سلیمہ کو غلبہ ہو گا تو ضرور ریاضت اور مجاہدہ کی دشواریوں کو برداشت کیا جائے گا اور ایمان نام ہے علم و عمل کا اور عمل کے مختلف شعبے ہیں جن میں بعض کا کرنا اور بعض سے باز رہنا مقصود ہے۔ اسی طرح اخلاق و عادات میں عادات محمودہ سے آراستہ ہونا ضروری ہے اور خصائل رذیلہ سے خالی اور پاک رہنا لازمی اور یہ درجہ بغیر صبر کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے صبر کو آدھا ایمان فرمایا ہے۔ اور چونکہ صبر کبھی شہوت کے مقابلہ میں اور کبھی غصہ کے مقابلہ میں ہوتا ہے اور روزہ شہوت کے توڑنے کا نام ہے اسلئے روزہ کو نصف صبر فرمایا گیا۔

صبر کے تین درجے

اعلےٰ درجہ یہ ہے کہ شہوت اور ہوائے نفس کے مادہ ہی کا قلع قمع ہو جائے تاکہ اس کو مقابلہ کی قدرت ہی نہ رہے اور اس پر ثبات و بقا نصیب ہو ایسے نفس کو نفس مطمئنہ کہہ کر مرتے وقت بشارت دی جائے گی کہ اے نفس مطمئنہ چل اپنے پروردگار کی طرف تو اللہ سے راضی اور اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی ہے۔

ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہوائے نفسانی غالب آجائے اور قلب کو شیطانی لشکر کے حوالہ کردے اسی خطرناک حالت والوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ، میرا فرمان صادر ہو چکا کہ میں تم سے جہنم بھر دوں گا۔ اس کی دو علامتیں ہیں:

ایک یہ کہ ایسا شخص کہا کرتا ہے مجھے توبہ کا شوق تو ہے مگر مجھ سے ہو نہیں سکتی۔ اور اسی لئے اب اس کی کچھ خواہش بھی نہیں رہی یہ یاس اور ناامیدی کا درجہ ہے جو مہلک ہے۔ اور اس سے جاں بری کی امید نہیں رہی۔

دوسری علامت یہ ہے کہ توبہ کا شوق بھی نہ رہے اور کہنے لگے اللہ رحیم و کریم ہے اس کو میری توبہ کی کچھ پرواہ نہیں اگر توبہ کے بغیر وہ مجھ کو جنت میں بھیج دے گا تو اس سے جنت جیسی وسیع جگہ میں کمی نہیں ہو جائے گی اور نہ ہی خدا کی رحمت میں کچھ کمی آجائے گی۔ یہ بیچارہ کم عقل متحیر ہے اور یاس گرفتار ہوا و ہوس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مسلمان کافروں کے ہاتھ میں مقید ہو جائے اور کافر اس کو کبھی خنزیر کے چرانے اور کھلانے پلانے کی خدمت سپرد کردیں اور کبھی اس کی گردن اور کمر پر شراب کے پیپے لاد کر اپنے گھروں تک لے جائیں اور یہ مسلمان اس ذلیل حالت کو ذلیل نہ سمجھے۔ بھلا اس کی نجات کی کیا صورت ہو سکتی

اگر بادشاہ کی کسی پیاری اولاد کو پکڑ کر کسی ذلیل غلام کے حوالہ کر دیا جائے کہ وہ اس کو اپنا غلام بنائے جو چاہے خدمت لیا کرے تو اس بے چارہ شہزادہ کا کیا حال ہو گا۔ اسی طرح اس غفلت شعار مسلمان کا حال ہے جس نے حق تعالیٰ کے تقرب پر دنیاء دنی کو اس طرح ترجیح دی اور ہوائے نفسانی کا قیدی ہو گیا کہ توبہ اور توجہ الی اللہ کا شوق بھی اس کے دل سے جاتا رہا۔ نعوذ باللہ من ھذا الحال الردی

صبر کا درمیانی درجہ

درمیانی درجہ یہ ہے کہ خدائی لشکر اور شیطانی گروہ میں جنگ و جدال قائم رہے کبھی اس کا پلہ بھاری ہو جائے اور کبھی اس کا پلہ، نہ اس کو کامل شکست ہو اور نہ اس کی کھلی فتح ایسے شخص کے بارے میں ارشاد ہے کہ یہ لوگ ہیں جنھوں نے اعمال صالحہ کو بدکاریوں میں خلط کر رکھا ہے۔ امید ہے کہ حق تعالیٰ ان پر توجہ فرمائے، اس کی علامت یہ ہے کہ ضعیف خواہشوں کو ترک کرے اور کبھی ان کے مقابلہ میں عاجز ہو جائے مگر اپنے مغلوب ہونے پر حسرت اور افسوس کرے اور کوشش میں لگا رہے کہ کسی طرح نفس پر قابو حاصل ہو جائے تو بہتر ہے اسی کو جہاد اکبر کہا گیا ہے اور اس میں دیکھنا ہے کہ کہاں تک فتح پاتا ہے اگر مغلوب رہا اور قوت عقل کو غلبہ نہ دے سکا تو جانور کے برابر ہے بلکہ اس سے بھی بدتر، کیونکہ ان میں تو عقل ہی نہیں ہے اور اس میں عقل ہے۔ اور اگر غالب آگیا تو کام بن گیا۔

خوش حالی میں صبر کی ضرورت

انسان تمام عمر ہر حالت میں صبر کا محتاج ہے، کیونکہ دنیا میں دو ہی حالتیں ہوتی ہیں یا اپنی مرضی کے مطابق یا مخالف۔ پس اگر مرضی کے موافق حالت ہے مثلاً تندرستی تونگری اولاد عزت و جاہ سب کچھ حاصل ہے تب تو صبر کی ضرورت ظاہر ہے کہ اگر نفس کی باگ نہ تھامیگا

تو یہ سرکش شرارت کرے گا اور تنعم اور تلذذ میں بے باکانہ قدم رکھے گا یعنی خواہشات کے پیچھے ہولے گا اور اپنی ابتداء اور انتہا سب کو بھول جائے گا اس لیے صحابہ کرام فرماتے ہیں کہ ہم تنگی و فقر کے فتنے میں مبتلا ہوئے تو صابر نکلے مگر فراخی و وسعت کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو صبر نہ کر سکے اور فراخی میں صبر کرنے کے یہی معنی ہیں کہ قلب کا میلان اس دنیا کی متاع کی جانب نہ ہو بلکہ یہ سمجھے کہ جو کچھ بھی مجھ کو عطا ہوا ہے وہ میرے پاس خدا کی امانت ہے جو عنقریب مجھ سے واپس لے لیا جائے گا۔ پس جب تک وہ میرے پاس ہے اس وقت تک مجھے شکر ادا کرنا چاہیئے اور اگر خدانخواستہ غفلت اور اتباع ہوا میں مشغول ہو گیا تو غافل کہا جائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اپنی خواہش کے مخالف حالت ہو، اسکی چار قسمیں ہیں:

پہلی قسم: ان طاعات پر صبر کرنا ہے جن سے نفس گھبراتا ہے اور بھاگتا ہے مثلاً کسل کی وجہ سے نماز پڑھنا ناگوار ہے اور بخل کی وجہ سے زکوٰۃ دینا گراں اور کسل و بخل دونوں وجہ سے حج اور جہاد کرنا دشوار پس نفس پر جبر اور اطاعت پر صبر کرنا اگرچہ گراں گزرے مگر لازم ہے کہ اس گرانی کا تحمل ہو اور نفس کو زیر کرے اور جب نفس مطیع ہو گیا تو پھر تین قسم کے صبر کا حکم ہو گا۔

۱۔ عبادت کے شروع کرنے سے پہلے اخلاص پیدا کرنے اور ریا وغیرہ کے دور کرنے کا۔

۲۔ حالت عبادت میں صبر کرنا کہ آداب و سنن و مستحبات کے ادا کرنے میں کاہلی نہ کرے اور اول سے آخر تک حضور قلب قائم رہے۔ وسواس و خطرات سے محفوظ رہے۔

۳۔ عبادت سے فارغ ہونے کے بعد صبر کرنا کہ ریا و سمعہ کے طور پر اس کا اظہار اور لوگوں سے اپنی عبادت کا ذکر کرنا نہ پھرے۔

دوسری قسم: معاصی سے صبر کرنا خصوصاً ایسی معصیت سے جس کا نفس عادی ہو اور اس کا مزہ پڑا ہوا ہو بالخصوص ایسی معصیت کہ اس میں کچھ خرچ کرنا نہ پڑے جیسے غیبت کرنا جھوٹ

بولنا اور خود ستائی وغیرہ۔

درحقیقت ان معصیات سے بچنا بڑے بہادر کا کام ہے۔

تیسری قسم: ان چیزوں پر صبر کرنا ہے جو گو اختیاری نہیں مگر ان کا تدارک اور تلافی قبضہ میں ہے مثلاً کسی ایسے شخص سے ایذا پہونچے جس سے انتقام لیا جا سکتا ہے مگر اس پر صبر کیا جا سکے۔ اور انتقام نہ لیا جائے کبھی واجب ہے اور کبھی مستحب۔

ایک صحابیؓ فرماتے ہیں کہ جب تک مسلمان ایذا پر صبر نہ کرتا تھا ہم اس کے ایمان کو کامل نہ سمجھتے تھے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ وہ کافروں کی ایذائیں برداشت کرتے اور یوں کہتے ہیں کہ ہم ان تکلیفوں پر ضرور صبر کریں گے جو تم ہم کو پہونچاؤ گے۔

چوتھی قسم: وہ ہے جو بالکل غیر اختیاری ہو کہ اس کی تلافی بھی اپنے اختیار میں نہ ہو جیسے کسی عزیز کے مر جانے یا مال گم اور ضائع ہو جانے کی مصیبت یا کسی مرض و بیماری کا پیدا ہو جانا یا کسی عضو کا جاتا رہنا، غرض تمام بلاؤں و حوادثات پر صبر کرنا اس چوتھی قسم میں داخل ہے جس کا بڑا درجہ ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے جب میں کسی بندہ کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے یعنی شکایت کا کلمہ زبان پر نہیں لاتا تو میں اس کا معاوضہ اس کو دیتا ہوں اور پاک و صاف کر کے اپنی رحمت کے جوار میں لے لیتا ہوں غرض آدمی کسی حالت میں بھی ہو صبر سے مستغنی نہیں

شکر کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے، اگر تم شکر کرو گے تو ہم تم کو زیادہ دیں گے۔
رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کھانے والا شکر گزار برابر ہے روزہ دار صابر کے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک عبادت کرتے کرتے ورم کر آتے تھے اور آپؐ تہجد میں گریہ وبکا بہت فرماتے تھے۔
ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ آپ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہو گئے ہیں پس اس قدر گریہ وبکا آپؐ کیوں فرماتے ہیں۔
آپؐ نے جواب دیا کہ اے عائشہؓ! کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ ہوں۔ واقعی شکر کا مرتبہ نہایت عالی اور صبر و خوف و زہد اور تمام مذکورہ مقامات سے بلند تر ہے۔ کیونکہ جن اوصاف اور اخلاق کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ان میں سے کوئی بھی صفت اور خلق مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ سب مقصود بالغیر ہیں۔ چنانچہ صبر اس لئے مطلوب ہے کہ ہوائے نفس کا قلع قمع ہو جائے اور خوف اس لئے مقصود ہے کہ کوڑے اور ڈرے کا کام دیکر مقام مطلوب تک پہونچائے۔ اور زہد سے مقصود ان تعلقات سے بھاگنا ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بے توجہ اور غافل کر رکھا ہے لیکن شکر ایک ایسی صفت ہے جو مقصود بالذات اور فی نفسہٖ مطلوب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شکر کا وجود جنت میں بھی ہوگا

توبہ، خوف، زہد اور صبر کی وہاں مطلق حاجت نہیں اور وہاں کی نعمتوں پر بندے شکر ضرور ادا کریں گے۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ اہل جنت کا آخری قول اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ہو گا۔

شکر کی حقیقت

شکر کے چار ارکان ہیں:

اول: نعمت اور منعم سے واقفیت اور یہ سمجھنا کہ تمام نعمتیں حق تعالیٰ ہی رحمت فرماتا ہے۔ اس کے جملہ وسائط اور وسائل وہی پیدا کرتا ہے اس امر کے سمجھنے سے دو باتیں پیدا ہوں گی۔ ایک منعم سے خوش ہونا اور دوسرے اس کی خدمتگزاری اور تعمیل حکم میں سرگرمی کہ انھیں دو حالتوں کا نام حال و عمل ہے:

دوم منعم کی اس نعمت سے اس لئے خوش ہونا کہ یہ اس کا عطیہ ہے اور خشوع و تذلل کی کیفیت ظاہر کرنا کیونکہ بادشاہ اگر کسی غلام کو مثلاً گھوڑا عطا کرے تو اس کی خوشی اس غلام کو تین وجہ سے ہو گی۔

۱۔ کام کی چیز ہاتھ آئی۔ اس پر سوار ہو کر اپنی بہت سی ضرورتوں کو پورا کر سکے گا۔

۲۔ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی مجھ پر خاص توجہ اور عنایت ہے۔ جس سے آئندہ کسی بڑی اور اس سے بھی زیادہ مفید نعمت کے ہاتھ آنے کی قوی توقع ہے۔

۳۔ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے منعم اور آقا کے حضور میں حاضر ہو کر شاہی خدمت بروقت بجا لا سکے گا۔

سوم: نعمت کو اپنے منعم کی رضامندی میں استعمال کرنا مثلاً آنکھ اللہ کی نعمت ہے اور اس کا شکریہ ہے کہ اس کو اللہ کی کتاب قرآن مجید اور علم دین کی کتابوں کے دیکھنے اور آسمان و زمین جیسی بڑی مخلوق کے مشاہدہ کرنے میں اس لئے صرف کرے کہ عبرت حاصل ہو

اور خالق برتر کی عظمت و کبریائی سے باخبر بنے اور ستر اور غیر محرم عورت پر نظر ڈالنے سے اس کو روکے رکھے۔ اسی طرح کان ایک نعمت ہے اور اس کا شکر یہ ہے کہ اس کو ذکر الٰہی اور ان باتوں کے سننے میں استعمال کرے جو آخرت میں نفع دیں اور کسی کی ہجو اور لغو اور فضول کلام سننے سے روکے۔ زبان کو ذکر اللہ، حمد و ثنا اور اظہارِ شکر میں مشغول رکھے۔ اور تنگ دستی یا تکلیف میں شکوہ و شکایت زبان پر نہ لائے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی مزاج پرسی کرے تب بھی شکایت کا کلمہ زبان سے نہ نکلے کیونکہ شہنشاہ کی شکایت ایسے بے بس اور ذلیل غلام کے سامنے جو کچھ بھی نہیں کر سکتا، زبان سے نکالنا نہایت فضول اور معصیت میں داخل ہے۔ ہاں اگر کلمۂ شکر زبان سے نکلے گا تو طاعت میں شمار ہوگا، قلب کا شکر یہ ہے کہ اس کو فکر و ذکر اور معرفت و اخلاص میں استعمال کرے۔ اوصاف حمیدہ سے اسکو آراستہ اور خصائل رذیلہ سے صاف و پاک رکھے۔ غرض ہاتھ پاؤں تمام اعضاء اور مال و متاع اور عزت و جاہ سب کا شکر یہی ہے کہ ان کو حق تعالیٰ کی طاعت میں رکھا جائے۔

درحقیقت کمال درجہ کا شکر تو وہی بندے ادا کر سکتے ہیں جن کو شرح صدر ہو چکا ہے اور جن کے قلوب کے اندر حق تعالیٰ نے حکمت اور معرفت کا نور بھر دیا ہے کہ وہ ہر چیز کے رموز و اسرار سے واقف ہیں اور ہر شئی میں اپنے محبوب کا جلوہ دیکھتے ہیں اور جس کو یہ درجہ حاصل نہیں اس کو سنت کی اتباع اور حدودِ شریعت کا لحاظ رکھنا ضروری ہے مثلاً کسی نامحرم پر نظر ڈالی تو آنکھ کی نعمت کا کفران ہوا، نیز آفتاب اور تمام ان نعمتوں کی ناشکری ہوئی جن کو بصارت میں دخل ہے اور جن کے بغیر کچھ نظر نہیں آسکتا۔ کیونکہ آنکھ کے بغیر بینائی کام نہیں دے سکتی اور آفتاب کے بغیر آنکھ بیکار ہے کہ اندھیرے میں آنکھ کچھ بھی کام نہیں دے سکتی اور آفتاب اپنے وجود میں آسمان کا محتاج ہے۔ پس آنکھ

کی ایک بدنظری سے گویا آسمان و زمین سب ہی کا کفرانِ نعمت ہوگا۔ یہی حال تمام معصیتوں کا ہے کہ تمام نعمتوں کا تعلق باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہے اور ایک کو دوسرے سے علاقہ ہے۔

اخلاص وصدق کا بیان

اخلاص کے ارکان اخلاص کی اصل نیت ہے اور اخلاص کا کمال صدق ہے اور اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ نیت میں کسی شئے کی آمیزش نہ ہو۔ لہذا اخلاص پیدا کرنے کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہوگی۔ اول نیت دوم اس میں کسی قسم کی آمیزش نہ ہو سوم صدق، اب ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ اس طرح سمجھئے۔

رکن اول نیت: حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ اے محمد اپنے پاس سے ان کو علیحدہ نہ کرو جو صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔ اسی ذات کو چاہ کر۔ اس آیت سے مراد ہے کہ عمل سے حق تعالیٰ کی ذات مقصود ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ کچھ لوگوں کے صحیفۂ اعمال حق تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے اور حق تعالیٰ فرمائے گا کہ ان کو پھینک دو کہ ان اعمال سے کسی شخص کو میری ذات مقصود نہ تھی اور کچھ بندوں کا نامۂ اعمال پیش ہوگا اور حکم ہوگا کہ فلاں فلاں عمل درج کرو۔ فرشتے عرض کریں گے کہ بارالہا وہ اعمال تو اس نے کئے نہیں تھے۔ حکم ہوگا کہ ان اعمال کی اس نے نیّت تو کی تھی اور اس کا ہمیں علم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آدمی چار قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) جس کو علم و مال دونوں دیے

گئے اور اس نے بمقتضاءِ علم مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔

۲۔ جو دونوں سے محروم مگر وہ کہتا ہے کہ اے اللہ اگر تو مجھ کو بھی علم و مال عطا کرتا تو تیری راہ میں خرچ کرتا یہ دونوں اجر میں مساوی ہیں۔

۳۔ جس کو صرف مال عطا ہوا علم نہیں جس کی وجہ سے مال کو بے محل خرچ کرتا ہے۔

۴۔ مالدار کو دیکھ کر کہتا ہے مجھ کو بھی مال عطا فرما تاکہ میں بھی اس کو فضول خرچ کروں پس یہ دونوں گناہ میں برابر ہیں۔

بنی اسرائیل میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ اس نے ریت کے ایک بڑے ٹیلے کو دیکھ کر کہا کہ خدایا تو اس کو میرے لئے غلہ کا ڈھیر کر دے تو میں اس کو تیری راہ میں خرچ کروں۔ حق تعالیٰ نے اس زمانے کے نبی پر وحی بھیجی کہ اس شخص سے کہدیں کہ ہم نے تمہاری خیرات قبول کرلی گویا کہ حق تعالیٰ نے اس کی نیت کی قدر فرمائی۔ درحقیقت نیت کو عمل میں بہت بڑا دخل ہے۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی سے قرض لے کر اس کے ادا کرنے کا قصد نہ رکھتا ہو تو یہ قرض نہیں بلکہ سرقہ اور چوری ہے۔

نیت کی حقیقت: نیت کے معنی ارادہ اور قصد کے ہیں کہ اس سے کسی کام پر قدرت پیدا ہوتی ہے۔ اور نیت کے متعدد ہونے سے ایک عمل پر متعدد اعمال کا ثواب ملتا ہے۔ کسی کام کے لئے گھر سے باہر قدم نکالے۔ اور اس میں بہت سی نیتیں جمع کر لیجئے۔ تمام ثواب مرتب ہوگا۔ یہی حال معصیت کا بھی ہے کہ ایک گناہ کے وقت اگر متعدد گناہوں کی نیت کیجئے تو ایک معصیت پر متعدد معصیتوں کے گناہ مرتب ہوں گے۔

نیت کا دوسرا رکن اخلاص ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ لوگوں کو اسی کا حکم ہوا ہے کہ

صرف اللہ ہی کی عبادت کریں مخلص بن کر۔ اور وہی لوگ نجات پانے والے ہیں جنہوں نے توبہ کی اور اپنی حالت سنواری اور اللہ کو مضبوط پکڑا اور اپنے دین میں اللہ کے واسطے اخلاص کیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جس شخص نے چالیس دن اخلاص کے ساتھ کوئی نیک عمل کیا تو حق تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے زبان پر جاری فرما دے گا۔

اخلاص کی حقیقت: کسی دوسری شئی کی آمیزش نہ ہو۔ اصطلاح شرع میں اخلاص کے معنی ہیں کہ محض حق تعالیٰ کی ذات مقصود ہو جس طرح الحاد کے معنی مطلقاً میلان کے ہیں، اور شرع میں حق سے باطل کی طرف میلان کو الحاد کہتے ہیں۔ اخلاص چونکہ دشوار تر ہے۔ اس لئے بعض اہل بصیرت کا قول ہے کہ اگر ایک ساعت بھی اخلاص حاصل ہو جائے تو نجات کے لئے کافی ہے۔

حضرت سلیمان درانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مبارک ہو اس کو کہ جس کا ایک قدم بھی ایسا اٹھا جس سے صرف خدا ہی کی ذات مقصود ہو۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ اپنے نفس کو مارتے اور فرماتے، اے نفس اخلاص پیدا کر تاکہ خلاصی حاصل ہو جائے۔

نیت کا تیسرا رکن صدق ہے۔ اور یہی اخلاص کا کمال ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارے بندے وہ ہیں جو اپنے عہد میں سچے ثابت ہوئے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، انسان سچ بولتا اور اس کا جویاں بنا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں صدیق لکھا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت حق تعالیٰ نے صدیق فرمائی۔ صدیق کی فضیلت اس سے ظاہر ہے کہ یہ صدیقین کا درجہ ہے۔

صدق کے چھ درجے ہیں۔ جو شخص ان میں کمال حاصل کرتا ہے وہ صدیق کہلاتا ہے۔

۱۔ صدق قول اور اس کا کمال : کہ ہر حالت میں سچ بولے اور اس کے کمال دو ہیں۔ اول یہ کہ تعریض سے بھی اجتناب کرے کیونکہ تعریض اگرچہ سچ ہی میں داخل ہے مگر سننے والا اس سے خلاف واقعہ مضمون سمجھتا ہے۔ دوم، ان اقوال میں بھی صدق اور سچائی کا خیال رکھے جو حق تعالیٰ کے سامنے عرض کرتا ہے مثلاً نماز میں زبان سے کہتا ہے اِنّی وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلّٰہ اور دل میں ماسوی اللہ کا خیال ہو۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ پس اگر دل زر و دنیا کی طلب میں ہے تو صدق نہیں بلکہ کذب ہے۔

نیت کا صدق : دوسرا درجہ نیت میں صدق کا ہے یعنی ایسا اخلاص کہ جس میں عبادات اور فعل خیر کے قصد میں کسی دوسرے ارادہ اور قصد کی مطلق آمیزش نہ ہو۔

عزم کا صدق : تیسرا درجہ عزم میں صدق کا ہے اس میں اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ جان جاتی رہے مگر عزم میں خلل نہ آئے اور کوئی ضعف و تذبذب پیدا نہ ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میری گردن اڑا دی جائے تو یہ مجھ کو اس سے زیادہ محبوب ہے کہ اس گروہ پر حاکم بنوں جس میں ابو بکرؓ موجود ہوں۔ پس عزم کے قوی اور مضبوط ہونے ہی کا نام عزم کا سچا ہونا ہے۔

عزم کے پورا کرنے میں صدق : چوتھا درجہ عزم کے پورا کرنے میں سچائی ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ سے عہد کر چکے تھے کہ اگر ہم کو مال عطا ہوا تو ضرور اس کو خیرات کریں گے۔ مگر جب اللہ پاک نے اپنے فضل سے ان کو مال مرحمت فرما دیا تو بخل کرنے اور منہ پھیرنے لگے۔ انجام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں نفاق پیدا کر دیا۔

صدق حال: پانچواں درجہ یہ ہے کہ ظاہر و باطن یکساں ہو یعنی ظاہر بھی ویسا ہی ہو جو اسکی واقعی اور باطنی حالت ہے مثلاً نرم چال سے چلے اور ظاہر کرے کہ طبیعت میں وقار ہے مگر حقیقت میں قلب کے اندر وقار نہ ہو بلکہ محض لوگوں کو دکھانے کے لئے ایسا کرے تو اس کا نام ریا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی ہے بار الہٰی میرا ظاہر میرے باطن سے بہتر بنا دے اور ظاہری حالت بھی صالح بنا۔

صدق دینی: چھٹا درجہ دین کے مقامات اور مدارج میں سچائی کا ہے یعنی خوف و رجا اور محبت و رضا اور توکل و زہد وغیرہ کا وہ انتہائی مرتبہ حاصل کرے جو اسم بامسمّٰی بنا دے، کیونکہ ابتدائی درجہ میں ان صفات کا صرف نام ہی نام ہوا کرتا ہے اور انتہائی درجہ میں پہونچکر سچا خوف اور سچی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ مومن وہی ہے جو اللہ و رسول پر ایمان لائیں پھر نہ کچھ شبہ کیا اور نہ اللہ کے راستہ میں اپنی جان و مال سے دریغ کیا، یہی لوگ سچے ہیں۔

غرض صدق کے ان چھ درجوں میں کامل ہو جانے سے صدیق کا لقب عطا ہوتا ہے اور جس کو ان میں سے کوئی درجہ حاصل نہیں تو اس کو مقدار کے موافق صدق کا مرتبہ حاصل ہوگا۔

توکّل کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔ لوگو! اگر تم ایماندار ہو تو خدا پر توکل کرو، اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہو وہ تم کو رزق نہیں دے سکتے۔ پس رزق اللہ ہی کے پاس سے طلب کرو۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اگر تم خدا پر پورا توکل کروگے تو حق تعالیٰ تم کو اس طرح رزق دے گا جس طرح پرند کو دیتا ہے۔ یعنی بلا تعب و مشقت کے صبح کو بھوکا اٹھتا ہے اور شام کو پیٹ بھرا واپس ہوتا ہے۔ یاد رکھو کہ جو شخص اللہ کا ہو رہتا ہے حق تعالیٰ اس کو ایسی جگہ سے رزق پہونچاتا ہے۔ جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

توکل کی حقیقت اور اس کے ارکان: توکّل اس حالت کا نام ہے جو حق تعالیٰ کو یکتا، فاعل مختار اور تمام صفاتِ کمالیہ میں مستقل اور لاشریک سمجھنے سے بندہ کے دل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کے بعد یہ حالت اور کیفیت ایسے کام کراتی ہے۔ جن سے توکل اور اعتماد ظاہر ہوا کرتا ہے لہذا توکّل کے تین رکن ہیں۔ اول معرفت دوم حالت، سوم اعمال۔

رکن اول معرفت: یعنی توحید حق سبحانہ و تعالیٰ جس کا اقرار کلمہ توحید سے ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کا ملک ہے اور اسی

کی حمد و ثنا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اس میں اس مضمون کا اقرار ہے کہ حق تعالیٰ اپنی قدرت، وجود اور حکمت میں وہ کمال رکھتا ہے جس کی وجہ سے حمد کا مستحق ہے۔ پس جس نے صدق و اخلاص کے ساتھ اس کا اقرار کر لیا اس کے قلب میں اصل ایمان راسخ ہو گیا، اور اب توکل کی حالت ضرور پیدا ہو گی بشرطیکہ صدق دل سے اقرار کیا ہو اور صدق دل کا مطلب یہ ہے کہ اس اقرار کے معنی قلب پر ایسے غالب آجائیں کہ دوسرے مضمون کی اس میں گنجائش نہ رہے۔

رکن دوم حال: اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے کام خدا کے حوالہ کر دو اور قلب کو مطمئن رکھو کہ غیر اللہ کی طرف التفات نہ کرو۔ یعنی ایسے ہو جاؤ جیسے کسی ہوشیار اور شفیق و غمخوار وکیل عدالت کو مقدمہ میں وکیل بنا کر مطمئن اور بے فکر ہو جایا کرتے ہو کہ پھر کسی دوسرے کی جانب تمہارا دل ڈانواں ڈول نہیں ہوتا۔ کیونکہ سمجھتے ہو کہ تمہارا وکیل ہر طرح عقلمند اور تمہارا خیر خواہ ہے اور تمہارے حریف کو کبھی تم پر غلبہ نہ پانے دے گا۔ اور مخالف بیچارے اس کے سامنے بات ہی نہ کی جائے گی اسی طرح جب جانتے ہو کہ رزق اور موت و حیات اور مخلوق کے سب چھوٹے بڑے کام خدا ہی کے قبضہ و اقتدار میں ہیں اور کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ اس کے جود و سخا اور حکمت و رحمت کی انتہا ہے پھر وجہ کیا کہ اپنے قلب کو مطمئن نہ بناؤ اور اس کے غیر سے نظر نہ اٹھاؤ۔ پس اگر اتنا مان کر بھی توکل نہ ہو تو سمجھ لو کہ اس کا سبب دو باتوں میں سے ایک بات ضرور ہے۔

اللہ تعالیٰ پر توکل و اعتماد نہ ہونے کے اسباب:

پہلا سبب: یا تو پورا یقین ہی حاصل نہیں اور نعوذ باللہ حق تعالیٰ کے رزاق اور قادر اور سمیع و بصیر ہونے میں کچھ شک ہے اور یا یہ یقین تو ہے مگر قلب پر اس علم و یقین کا اثر

نہیں ہوا بلکہ ایسی حالت ہے جیسے موت کے تیقن کی ہوا کرتی ہے کہ باوجودیکہ اس کا یقین حاصل اور اس کا علم ہے کہ ضرور ایک دن ہمیں مرنا ہے اور دنیا کو چھوڑنا ہے مگر پھر بھی ایسے نڈر ہیں کہ اس کی فکر کچھ نہیں کرتے سبب اس کا صرف یہی ہے کہ قلب پر اس یقین کا پورا اثر نہیں ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ تمہارا قلب پیدائشی طور پر ضعیف اور مکزور واقع ہوا ہے اور خلقتہً تم بزدل ہو کہ ضعف قلب کی وجہ سے تمہارا دل ایسے اوہام کا مطیع ہو گیا ہے، جو یقیناً باطل اور لاشیٔ محض ہیں جس طرح مردہ کے پاس اس کے بستر پر لیٹ کر سونے سے اکثر ڈر معلوم ہوا کرتا ہے۔ حالانکہ معلوم ہے کہ یہ مردہ ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ مگر پھر بھی اس کے پاس لیٹ کر نیند نہیں آتی اور ڈر معلوم ہوتا ہے۔ تو یہ واہیات توہمات ہی کی تو اطاعت ہے جس نے ضعیف قلب کو یقین پر عمل نہ کرنے دیا۔

رکن سوم: توکل کا تیسرا رکن اعمال ہیں۔ جاہلوں کا خیال ہے کہ توکل تو محنت مزدوری اور کسب کے چھوڑ دینے کا نام ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اور بیکار بن کر بیٹھ جائے۔ اگر بیمار ہو تو دوا اور علاج نہ کرے، بے سوچے سمجھے اپنے آپ کو خطرات و ہلاکت میں ڈال دیا کرے کہ کہیں آگ میں جھلس جائے اور کہیں شیر کے منہ میں اپنا ہاتھ دیدے تب متوکل کہلائے گا حالانکہ یہ خیال بالکل غلط اور لغو ہے کیونکہ ایسا کرنا شرعاً حرام ہے اور شریعت ہی توکل کی خوبیاں بیان کر رہی ہے پھر بھلا جس بات کو شریعت خود حرام بتائے اسی کی رغبت و حرص دلائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی سعی اور کوشش اکثر چار وجہ سے ہوا کرتی ہے۔ (۱) کسی نافع اور غیر محصّل چیز کے حصول کے لئے (۲) موجودہ چیز اور نفع کی حفاظت میں (۳) کسی آنے والے ضرر کے روکنے میں (۴) موجودہ نقصان کے

دور کرنے میں پہلی صورت جلب منفعت کہلاتی ہے اور اس کے تین اسباب ہیں :
ا۔سبب اختیار کرنے پر نفع کا حصول یقینی ہو۔ (۲) یا اس کا غالب گمان ہو
(۳) یا محض موہوم ہو۔

سبب اختیار کرنے پر نفع کا حصول یقینی ہو تو اس کو خدا کا عطیہ سمجھنا اور دل سے اس پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ اسباب پر سبب کا تفرع ضروری ہے جن کو حق تعالیٰ نے بطور قاعدہ تجویز فرمادیا ہے اور اس میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا ایسے اسباب کا اختیار کرنا شرعاً ضروری ہے جیسے پیٹ بھرنے کے لئے لقمہ بنا کر منہ میں لے جائے۔ اولاد کے لئے اپنی زوجہ سے ہم بستری کرنا، غلہ پیدا کرنے کے لئے تخم ریزی وغیرہ۔

اس میں توکل یہ ہے کہ مؤثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہی کو یقین کرے۔ ایسے اسباب اختیار کرنا جن سے نفع کے حصول کا غلبہ وگمان ہو تو یہ خلاف توکل نہیں مثلاً اپنی زادراہ کو چوری اور ڈاکہ سے محفوظ رکھنے کی سعی، کھانے کو سڑنے سے بچانے کی تدبیر اور جانور وغیرہ کو باندھ کر رکھنا۔ موہوم نتیجہ والی ہوس طمع کہلاتی ہے مثلاً زیادہ معاش حاصل کرنے میں حد سے زیادہ سعی اور دوڑ دھوپ کرنا کہ کوشش زیادہ کریں گے تو مال زیادہ ہوگا۔ یہ حالت حرص و طمع مال کہلاتی ہے اور اس کی بدولت بسا اوقات مشتبہ مال کے حاصل کرنے کی نوبت آجاتی ہے نیز یہ صورت توکل کے بھی خلاف ہے۔ غرض ایسے اسباب اختیار کرنا توکل کے خلاف ہے، جن پر سبب کا مرتب ہونا محض موہوم ہو، جیسے منتر پڑھنے اور داغنے سے مرض کا جاتا رہنا کہ محض موہوم بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔ ضعیف القلب کو تو یا کی حرص نہ کرنا چاہیئے۔ نیز اللہ تعالیٰ سے خرق عادت اور کرامت کی طلب قوی الایمان کو بھی جائز نہیں۔

محبت کا بیان

حق تعالیٰ فرماتا ہے " اللہ تعالیٰ نیک بندوں سے محبت کرتا ہے اور نیک بندے اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔"

جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب تک تمہارے نزدیک اللہ اور اس کا رسول ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہوگا اس وقت تک تمہارا ایمان کامل نہ ہوگا۔

حضرت صدیقؓ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو اللہ کی محبت میں مزا آجاتا ہے اس کو دنیا کی طلب بالکل نہیں رہتی اور وہ آدمیوں سے وحشت کھانے لگتا ہے۔

اہل کلام اور فلسفی چونکہ اللہ کی محبت کے معنی نہیں سمجھے اس لئے وہ اس کے منکر ہو کر کہنے لگے کہ جس ذات کا کوئی مثل نہیں اس کو ہماری طبیعت کے ساتھ مناسبت پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ ہماری عقل اس کا پورا ادراک کر سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے ساتھ محبت کے معنی بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس کے احکام کی تعمیل اور ارشاد کی تعمیل کی جائے۔ یہ بیچارے حقیقتِ محبت سے جاہل ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ محبت اپنے ہم جنس ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ ان کی فہم حقیقت الامر کو معلوم نہ کر سکی۔ لہٰذا اس جگہ پر مختصر طور پر محبت کی حقیقت بیان کی جاتی ہے تاکہ اصل بات معلوم ہو سکے۔

عشق ومحبت کی حقیقت اور چھٹا حاسہ

ہر لذیذ چیز انسان کو محبوب ہے اور محبوب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ طبیعت اس کی طرف کھنچتی اور نفس اس کی طرف مائل ہوتا ہے یہی میلان طبیعت بڑھ جاتا ہے تو عشق کہلانے لگتا ہے۔ اسی طرح کسی چیز کے ناپسند اور مبغوض ہونے کے یہ معنے ہیں کہ طبیعت اس سے نفرت کرتی ہے اور دل تکلیف پاتا ہے۔ پس جب یہ سمجھ میں آگیا تو اب غور کرو جتنی چیزیں تم اپنے حواس کے ذریعے سے ادراک کر سکتے ہو یا وہ تمہاری طبیعت کے موافق ہوں گی یا مخالف اور یا ایسی ہوں گی کہ نہ موافق ہیں اور نہ مخالف پس جو چیزیں طبیعت کے موافق ہیں وہ محبوب ولذیذ ہیں اور جو طبیعت کے مخالف ہیں وہ مبغوض وناگوار اور جو چیزیں نہ طبیعت کے موافق ہیں اور نہ مخالف ان میں نہ لذت آتی ہے اور نہ ان سے نفرت ہوتی ہے بلکہ مساوی حالت رہتی ہے اور لذت ہمیشہ ادراک کے بعد حاصل ہوا کرتی ہے مگر ادراک دو قسم کے ہیں۔ ایک ادراک ظاہری اور ایک ادراک باطنی۔

ظاہری ادراک حواس خمسہ کے ذریعہ سے ہوا کرتا ہے۔ مثلاً آنکھ کو کسی حسین اور خوبصورت کے دیکھنے سے لذت آتی ہے اور کان کو موزوں اشعار اور خوش الحان کے گانے اور سریلی آواز کے سننے میں لطف آتا ہے اور زبان وناک کو جن میں چکھنے اور سونگھنے کا حس رکھا ہوا ہے۔ مزیدار کھانوں اور خوشبودار پھولوں میں لذت آتی ہے اور تمام بدن کی قوت لامسہ کو نرم وملائم اور نازک چیز کے چھونے میں مزہ آتا ہے ان ہی چیزوں کو نفس کا محبوب کہا جاتا ہے کہ نفس بالطبع ان کی جانب مائل ہوتا ہے۔

اسی طرح انسان کو ایک چھٹا حاسہ اور بھی مرحمت ہوا ہے جو ادراک باطنی کہلاتا ہے اور اس کی جگہ انسان کا قلب ہے۔ اس چھٹے حاسہ کو کبھی قلب کہہ دیتے ہیں اور کبھی نور

اور کبھی چھٹا حاسہ۔ غرض نام جو کچھ بھی ہو مقصود یہ ہے کہ باطنی ادراک بھی حواسِ ظاہری کی طرح اپنے موافق و مخالف چیز سے لذت حاصل کرتا ہے۔

رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تمہاری دنیا میں سے میرے لئے تین چیزیں محبوب بنائی گئی ہیں یعنی خوشبو، عورتیں اور میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ ظاہر ہے کہ خوشبو سے قوتِ شامہ کو مزہ آیا اور خوبصورت عورت سے قوتِ باصرہ اور قوتِ لامسہ کو لذت حاصل ہوئی مگر نماز کی لذت حواسِ خمسہ ظاہریہ میں سے کسی حاسہ کو بھی نہیں آتی، بلکہ اس کی لذت صرف اسی چھٹے حاسہ کو آتی ہے جو باطنی ہے اور جس کا نام قلب ہے، یہی وجہ ہے کہ جس کا قلب بیکار ہے وہ نماز میں کبھی لذت نہیں پا سکتا اور اس لذت کا ادراک سلیم القلب ہی کو ہو سکتا ہے اور انسان کا امتیاز و شرف اس چھٹے حاسہ کی وجہ سے ہے ورنہ حواس ظاہری ہیں تو تمام حیوان مشترک ہیں کہ جانوروں کو بھی اچھی اور عمدہ آواز اور ذائقہ دار کھانے اور خوشبو سونگھنے اور نازک چیز کے چھونے کی رغبت ہوتی ہے۔ خوب سیرتی کا تلذذ باطنی حاسہ سے ہوتا ہے جس کا محل قلب ہے انسان جس طرح ظاہری آنکھوں کی بصارت سے حسین عورتوں کی لذت حاصل کرتا ہے اسی طرح قلب کی آنکھوں کی بصیرت سے خوب سیرتی کا مزہ اٹھاتا ہے بشرطیکہ قلب کی آنکھوں میں بینائی ہو مگر شاید تم باطنی سیر اور اس کی لذت کو نہ سمجھ سکو کہ کیا چیز ہے لہٰذا تم اپنے نفس کو ٹٹولو اور دیکھو کہ اس میں انبیاء و اولیاء اور صحابہ و علماء کی محبت ہے یا نہیں؟

نیز ایک بادشاہ تو منصف و بہادر اور سخی و عاقل اور اپنی رعیت پر مہربان ہو، اور دوسرا ظالم و بزدل بخیل و ناسمجھ اور اپنی رعیت کے ساتھ سخت دل اور کڑوے مزاج کا ہو تو ان دونوں میں تمہارا قلب کچھ امتیاز اور فرق کرتا ہے یا نہیں؟ ۔ اگر کرتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک کی طرف تمہارا دل کھنچتا ہے اور دوسرے

کی طرف نہیں کھنچتا بلکہ نفرت کرتا ہے۔ اگر غور کرو گے تو تمہاری سمجھ میں آجائے گا یہ وہی باطنی
ادراک ہے جو باطنی خوب سیرتی میں لذت پاتا ہے اسی طرح جس وقت مثلاً حضرت
علی کرم اللہ وجہہ کی شجاعت و بہادری یا ظل اللہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ
کی سیاست و عملداری یا خلیفۃ الحق حضرت صدیق عتیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سچائی و
جاں نثاری کے قصے سنتے ہو تو ایک امنگ و مسرت اور ان حضرت کی طرف ایک قسم کا میلان
پیدا ہوتا ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا اس سے زیادہ صاف بات سمجھنا چاہو تو غور کرو کہ لوگوں
کو اپنے مقتدائے مذہب اور صاحبِ شریعت امام کے ساتھ اتنا تعلق ہوتا ہے کہ جان و
مال کے خرچ کرنے میں بھی دریغ نہیں ہوتا حالانکہ ان کی آنکھوں نے کبھی ان کی صورت بھی
نہیں دیکھی، اگر دیکھتے بھی تو شائد اتنی محبت نہ ہوتی کیونکہ آنکھ کی لذت دوسرے قسم کی ہے
کہ اس لذت اور اُس لذت میں بہت فرق ہے اور اگر محبت ہوتی بھی تب بھی یہ محبت
جو ان اوصافِ حمیدہ کے ذریعہ سے ہوتی ہے محل گفتگو ہوتی کہ یہ بتاؤ یہ لذت کس حاسہ سے
ادراک کی گئی ؟ ظاہر ہے کہ یہ وہی چھٹا حاسہ ہے جس کی جگہ دل میں ہے کیونکہ دل ہی تو ہے
جس نے ان پیشواؤں میں وہ باتیں پائیں جن سے دل کو لذت حاصل ہوتی اس کے بعد اگر غور
وفکر کرو گے تو جن اوصاف کی وجہ سے محبت پیدا ہوتی ہے وہ نہیں نکلیں گے۔

محبت کے اسباب صرف علم و قدرت اور تقدس ہیں

۱۔ چونکہ مقتدایانِ دین کو اللہ اور
اس کے رسول اور آسمانی کتابوں کا علم حاصل ہے اور اللہ کے رسولوں کی شریعت کے دقائق
وحقائق سے واقف ہیں۔

۲۔ انھوں نے خدا کی دی ہوئی قدرت سے کام لیا کہ اپنے نفس کو مغلوب بنایا

نفسانی شہوتوں کو مٹایا اور حق کی سیدھی راہ پر جمے رہے اور نیز طاقت کو کام میں لا کر خدا کی مخلوق پر قبضہ کیا، سیاست و ملکی انتظام سے ہزار ہا میل کی آبادی کو زیر فرمان بنایا اور خدا کے برحق دین کی تلقین کر کے لوگوں کو سیدھا راستہ بتلایا۔

۳۔ عیوب باطنی سے پاک وصاف نظر آئے کہ جہالت و بخل، حسد و کینہ اور بغض و عداوت، غرض تمام بدخلقیوں سے بے عیب اور تمام عمدہ عادتوں اور اخلاق حسنہ سے متصف پائے گئے۔

یہی تین اوصاف ہیں جن کی وجہ سے ان میں یہ حُسن پیدا ہوا جس کو حیوانات نہیں سمجھ سکتے، یہ انسان ہی کی خصوصیت ہے کہ قلب کے چھٹے حاسہ سے اس باطنی حسن کا ادراک کرتا اور اس میں لذت پاتا ہے۔ غرض تم کو جب ان اوصاف کی وجہ سے پیشوایان مذہب اور اماموں کے ساتھ محبت ہو گئی تو ظاہر ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ کمالات بدرجۂ اتم موجود ہیں لہٰذا آپ کی ذات کے ساتھ جو محبت ہو گی وہ دنیا بھر کے علماء و انبیاء سے بڑھی ہوئی ہو گی۔ اس کے بعد آپ کو رسول بنانے والی ذات پر نظر ڈالو کہ جس نے تم پر اتنے احسان فرمائے ہیں کہ ہزار ہا انبیاء علیہم السلام کے علم و قدر اور تقدس کو حق تعالےٰ شانہٗ کے نامتناہی علم اور غیر محصور قدرت اور اوصافِ کمالیہ سے کوئی مناسبت ہی نہیں۔

خدا ہی کی ذات ہے جس میں کوئی عیب نام کو بھی نہیں اور اس کے سوا کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو ہر قسم کے عیب و نقص سے خالی ہو، اگر کسی مخلوق میں کوئی عیب نظر نہ آئے تو عجز و احتیاج اور عبودیت و غلامی بھی تو ایک نقص ہے جو کہ حضرات انبیاء علیہم السلام میں بھی موجود ہے کیونکہ اس سے مخلوق کا کوئی فرد بھی مستثنیٰ نہیں، چنانچہ سب جانتے ہیں کہ یہ

حضرات کھانے پینے کے بھی محتاج تھے نہ کسی کو رزق دے سکتے تھے نہ جلا سکتے تھے نہ فاعل مختار تھے،
قادر ذوالجلال کی قدرت اور انبیاء علیہم السلام کی قدرت میں کیا موازنہ ہو سکتا ہے ؟ اسی طرح
حق تعالیٰ کے علم لدنی پر نظر ڈالو تو ایک بحر ذخار ہے کہ کہیں اس کا کنارہ ہی نہیں اور کوئی ذرہ بھی
اس کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا آسمان و زمین عرش و کرسی لوح و قلم شجر و حجر غرض جو شئی خیال
و ذہن میں بھی نہیں آسکتی وہ اس علام الغیوب کے علم ازلی میں موجود ہے۔ الغرض انبیاء علیہم السلام
میں جو کچھ بھی صفات نظر آئیں وہ در حقیقت پرتو اور ظل ہیں صفات خداوندی کا پھر جب عیوب
کی جانب باوجود اس کے عارضی اور ظل آفتاب ہونے کے تمہارا نفس میلان کرتا ہے تو اس کے
مبداء و مصدر یعنے آفتاب کی جانب کیوں نہ مائل ہو گا۔

اور جب مستعار صفات کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ اس قدر محبت ہے تو مبداء صفات
یعنی حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ محبت کیوں نہ ہو گی اس کے علاوہ اگر تمہاری باطنی بصیرت حق تعالیٰ کے
جمال و جلال کا ادراک نہ کر سکے اور عشق پیدا نہ ہو تو کم از کم اتنا تو کرو گے کہ اس کے احسانات و
انعامات کو شمار کرو کہ وہ کتنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تم ان کو ہرگز شمار نہ کر سکو گے تو کیا اس سے بھی گئے
گذرے ہوئے کہ اس کو اپنا محسن ہی سمجھ کر محبوب سمجھو اور نفس کو اس کی جانب مائل کرو، محبت کا
ادنیٰ درجہ محسن کی محبت ہے۔ ذرا غور کرو کہ دنیا کی جس چیز میں بھی تم کو لذت حاصل ہوتی ہے اس کا
دینے والا اور باقی رکھنے والا کون ہے ؟

ذرا سی توجہ سے معلوم ہو جائے گا کہ کوئی لذت اور کوئی حظ اور کوئی مزہ اور کوئی نعمت ایسی
نہیں جو حق تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے نے دی ہو یا دے سکے پھر کیا اپنے محسن کے ساتھ محبت نہیں ہوا
کرتی ؟۔ اگر ہوتی ہے تو حق تعالیٰ کے ساتھ اصل محبت کا ہونا ضروری اور مقدم ہے۔ اس سے
میرا مطلب یہ ہے کہ اگر فرشتوں کی طرح تم کو حق تعالیٰ کے ذاتی جلال و جمال کی وجہ سے اسکی

محبت نہ ہو تو عام مخلوق کی طرح اس کو اپنا محسن ہی سمجھ کر اس سے محبت کرو کہ اس حدیث کا منشاء پورا ہو جائے جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرو بایں وجہ کہ تم کو غذا دیتا ہے اور مجھ سے محبت کرو بایں وجہ کہ حق تعالیٰ مجھ سے محبت فرماتا ہے۔ یہ محبت ضعیف اور کم درجہ کی ہے کیونکہ احسانات کے کم و بیش ہونے سے محبت بھی کم و بیش ہوتی رہے گی سو اس قسم کی محبت کرنے والا شخص اس غلام کی مثل ہے جو اپنے مطلب کی محبت رکھے اور بایں نیت خدمت کرے کہ مزدوری ملے گی اور اپنا پیٹ بھرے گا۔ اصل اور کامل محبت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ ان صفات محمودہ اور جلال و جمال کی وجہ سے محبت ہو جس میں اس کی ذات لاشریک ہے اور کوئی اس کا ہم پلہ نہیں اسی لئے اللہ پاک نے حضرت داؤد علیہ السلام کی جانب وحی فرمائی تھی کہ مجھے سب میں زیادہ پیارا وہ بندہ ہے جو میری عطا و احسان کے بغیر محض حق ربوبیت ادا کرنے کی غرض سے میری عبادت کرے اور زبور میں لکھا ہے اس سے ... وں جس نے جنت کی طمع یا دوزخ کے خوف سے میری عبادت کی پس اگر میں دوزخ و جنت کو نہ پیدا کرتا تو کیا عبادت کا مستحق نہ ہوتا۔

ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایسے لوگوں پر گذر ہوا جو خلوت میں بیٹھے عبادت کر رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہم جنت کی تمنا رکھتے ہیں اور دوزخ کا ڈر۔ حضرت روح اللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم کو مخلوق ہی کی طمع ہے اور مخلوق ہی کا خوف، وائے افسوس کہ خالق کیلئے کچھ بھی نہیں۔ آگے جا کر ایسے لوگوں پر گذر ہوا جو خلوت نشین تھے اور کہتے تھے کہ ہم تو محض خدا کی محبت اور اس کے جلال کی عظمت کی وجہ سے اس کی عبادت کر رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بیشک تم خدا کے ولی و مقرب ہو اور تمہارے ہی پاس بیٹھنے کا مجھ کو حکم ہوا ہے۔

محبت خدا کے آثار و علامات

محبت الٰہی کی علامتیں بے شمار ہیں جن کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں البتہ بعض علامتوں کا ذکر کرنا ضروری ہے، سو منجملہ ان کے یہ ہے کہ انسان نفس کی خواہش پر اپنے محبوب یعنی حق تعالےٰ کے حکم کو ترجیح دیتا اور اس کی تعمیل پر سب کاموں کو موخر سمجھتا ہے اور حدود شرعیہ کا ہر وقت لحاظ رکھتا ہے۔

دوم: اللہ کی ملاقات کا مشتاق ہوتا ہے اور موت سے گھبراتا نہیں اور اگر زندگی چاہتا ہے تو محض اس لئے کہ معرفت حق جتنی بھی زیادہ حاصل ہو اتنی ہی بہتر ہے تاکہ محبوب کے وصال میں لذت زیادہ ملے کہ معرفت مشاہدہ جمال کا تخم ہے، جتنا زیادہ پڑے گا اسی قدر پیداوار زیادہ ہوگی اسی طرح جسقدر معرفت کامل ہوگی اسی قدر مشاہدہ جمال حق میں لذت زیادہ حاصل ہوگی۔

سوم: حکم الٰہی اور قضا و قدر پر راضی رہتا ہے کہ خوشگوار اور ناگوار جو کچھ بھی پیش آتا ہے۔ اس پر زبان یا دل سے شکوہ نہیں کرتا، اب مناسب ہے کہ رضا بر قضا کا بھی کچھ بیان کر دیا جائے تاکہ انسان کو دھوکہ نہ ہو اور اس غرہ میں کہ مجھ کو محبت خدا حاصل ہو گئی ہے، محروم نہ رہ جائے۔ محبت حق کا حصول کوئی آسان چیز نہیں بلکہ نہایت دشوار ہے۔

رضا بر قضا

حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی شان میں فرمایا ہے: اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے۔
رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں حق تعالیٰ جب کسی بندہ کو محبوب بناتا ہے تو اسکو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ پس اگر وہ صابر رہا تو اس کو منتخب کرتا ہے اور اگر اس کی قضا پر راضی ہوا تو اس کو برگزیدہ کر لیتا ہے۔

ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند صحابہ سے پوچھا کہ تم کون ہو؟
انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہم مومنین مسلمین ہیں۔ آپؐ نے پوچھا کہ تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ مصیبت پر صبر کرنا اور راحت پر شکر کرتے اور قضا پر راضی رہتے ہیں۔

آپؐ نے فرمایا تم سچے مومن ہو۔
حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ اے داؤد تم بھی ایک کام کا مقصد اور ارادہ کرتے ہو اور میں بھی ارادہ کرتا ہوں، مگر ہوتا وہی ہے جو میں ارادہ کرتا ہوں۔ پس اگر تم میرے ارادہ و مشیت پر راضی رہے اور فرماں دار بنے رہے تو میں تمہارے چاہے کی تلافی بھی کروں گا اور تم سے خوش بھی رہوں گا اور اگر میرے ارادہ پر راضی نہ ہوئے تو تم کو مشقت و تکلیف میں ڈالوں گا اور انجام کار ہوگا وہی جو میں چاہوں گا باقی مفت کی پریشانی تمہارے سر پڑے گی۔

تکلیف پر راضی و خوش ہونے پر عقلی وجوہات و نظائر:

ایک فرقہ رضا کا منکر ہے اور اس کا خیال جسے وہ دلیل سمجھے ہوئے ہے یہ ہے کہ جو چیز اپنی خواہش کے خلاف ہوگی اس پر راضی اور خوش ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں البتہ ناگوار پر صبر ضرور ہو سکتا ہے مگر یہ خیال ناسمجھی اور قصور فہم کی علامت ہے جس طرح وہ لوگ محبتِ الٰہی کے سمجھنے سے قاصر رہے ہیں اسی طرح رضا بر قضا کی صورت کو نہیں سمجھ سکے۔ لہٰذا غور کرو کہ بلا اور تکلیف پر راضی ہونا اور خواہشِ نفس و طبیعت کے خلاف پر خوش ہونا تین وجہ سے ممکن ہے۔

اول دنیا کی مخلوق ہی میں دیکھ لو کہ فرطِ محبت اور جوشِ شوق میں انسان کو اکثر تکلیف اور درد محسوس نہیں ہوا کرتا چنانچہ معشوق مارتا ہے مگر اس کی تکلیف نہیں ہوتی اور محبت کا درجہ تو بلند ہے غلبۂ شہوت اور غصہ کے جوش میں بھی ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ بدن پر زخم آجاتا ہے اور سر پھٹ جاتا ہے کہ خون بہنے لگتا ہے اور جسم لہولہان ہو جاتا ہے مگر اس وقت کچھ بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اسی طرح تم نے کبھی اپنی حالت پر نظر ڈالی ہوگی کہ جس وقت کسی مرغوب چیز کی ہوس اور شوق میں محو اور مستغرق چلے جا رہے ہو اور کانٹا چبھ جائے تو اس وقت اس کا درد و کرب بالکل محسوس نہیں ہوتا البتہ جب غصہ رفع یا شوق ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً مرغوب شی ملجاتی ہے یا اس کے حصول میں یاس و ناامیدی ہو جاتی ہے تو اس وقت چوٹ اور کانٹا چبھنے کی تکلیف محسوس ہونے لگتی ہے۔ جب ذرا سی محبت میں یہ حالت ہے کہ تکلیف محسوس نہیں ہونے پاتی تو زیادہ محبت میں تو کسی بڑی تکلیف کا بھی حس نہ ہوگا اور جب یہ حالت دنیا میں موجود ہے کہ خون و گوشت کے بنے ہوئے اس انسان کے عشق کی بدولت یہ حالت ہے جس کے پیٹ کے اندر منوں نجاست بھری ہوئی ہے اور صورت کی ناپائیدار اور معمولی خوبی نے اتنا اثر پیدا کر دیا ہے کہ آنکھوں کی بینائی غلطی کرنے لگی اور ناگوار چیز گوارا بن گئی اور بدصورت تسنی

خوبصورت نظر آنے لگی اور عیوب نے محاسن بنکر خوبیاں دکھانا شروع کر دیں تو حضرت حق جل جلالہٗ کے جمال ازلی کا عاشق اگر ناگوار کو گوارا اور ناپسند کو پسند کرنے لگے تو کیا بعید ہے جبکہ قلب کی بصیرت آنکھوں کی بصارت سے ہر طرح مقدم و اولیٰ ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ نے شیخ سری سقطیؒ سے دریافت فرمایا کہ کسی محب کو بھی بلا کی تکلیف ہوتی ہے؟ شیخ نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں، اگر ستر مرتبہ بھی تلوار سے مارا جائے تب بھی تکلیف نہ ہو۔

ایک عارف فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی محبت کے سبب مجھے اس کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت ہے۔ یہاں تک کہ اگر دوزخ کو وہ محبوب بنائے تو میں دوزخ ہی میں جانا محبوب سمجھوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی محبت کی آگ میں جلنے کی تکلیف بھی نہ ہو گی۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں کہ میرے لئے کوئی خوشی باقی نہیں رہی۔ ہاں اگر ہے تو بس حق تعالیٰ کے قضا و قدر پر رضا و سرور ہے۔ جو ہر وقت حاصل ہے۔

ایک صوفی کا حال لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ان کا چھوٹا بچہ تین دن تک گم رہا، ان سے کہا گیا کہ اگر آپ دعا مانگتے تو اللہ تعالیٰ بچہ لوٹا دیتا اور گمشدگی کی یہ تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ انھوں نے جواب دیا کہ بچہ کے گم ہونے سے زیادہ تکلیف میرے لئے یہ تھی کہ میں حق تعالیٰ پر اس کے حکم پر اعتراض کرتا ہوں۔

دوسری وجہ قضا پر راضی ہونے کی یہ ہے کہ تکلیف کی صورتوں میں تکلیف تو محسوس ہو مگر چونکہ عقل نے اس کے بہتر انجام ملنے والے اجر و ثواب پر مطلع کر دیا ہے اس لئے طبیعت اس تکلیف کو بغیر کلفت کے گوارا کرتی ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب کسی مریض کو پینے کے لئے تلخ دوا بنائے یا فصد کھلوانے کی ہدایت کرے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ اس تلخ دوا کا پینا

فصد
اور فصد کا کھلوانا تکلیف کی باتیں ضرور ہیں مگر چونکہ اس کے ساتھ ہی اس کے عمدہ نتیجے یعنی صحت وتندرستی سے مریض کو آگاہی حاصل ہے۔ لہٰذا وہ ان تکلیف کی باتوں کے بتانے والے طبیب سے راضی اور خوش بلکہ اس کا احسان مند اور ممنون رہتا ہے اسی طرح سوداگر اپنے سفر تجارت کی گوناگوں صعوبتوں اور مشقتوں پر راضی ہوتا ہے حالانکہ طبیعت ان تکالیف کو ناگوار سمجھتی ہے مگر چونکہ عقل نے اس مشقت کا اچھا نتیجہ وانجام سمجھا دیا ہے لہٰذا وہ ناگواری اس کی رضا ورغبت سے بدل جاتی ہے۔

تکلیف کے انجام یعنی ثواب کی وقعت نے تکلیف کا احساس کم یا گم کر دیا

جب دنیا کے ناپائدار فائدوں کی یہ حالت ہے کہ ان کی وجہ سے مشقت مشقت نہیں رہتی کہ آخرت کی سعادت حاصل کرنے میں بلا وتکلیف اور خلاف طبع مصیبتوں پر راضی ہو جانے سے کیوں تعجب ہوتا ہے؟

ایک پارسا عورت کے ایک مرتبہ ٹھوکر لگی اور پاؤں کا ناخون کٹ کر گر پڑا مگر وہ اس تکلیف پر واویلا مچانے کے بجائے مسکرا رہی تھیں اور ہنسنے لگیں۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا تم کو تکلیف معلوم نہیں ہوئی؟ جواب دیا کہ چوٹ لگنے پر اجر آخرت میں ملے گا اس کی حلاوت نے تکلیف کی تلخی کو چاٹ لیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے اس کا یقین کئے ہوئے ہے کہ دنیا کی ہر تکلیف پر حق تعالیٰ کی طرف سے اجر ورحمت ہو گا اور ہر مصیبت وصدمہ پر اس قدر ثواب عطا ہو گا جس کے مقابلہ میں اس عارضی تکلیف کی کچھ حقیقت نہیں تو وہ تکلیفوں پر ضرور مسرور وشاداں ہو گا۔

قضا وقدر کی حکمتیں اور اسرار۔ سوچنے سے تکلیف کا اثر نہیں ہوتا۔

تیسری وجہ قضا پر راضی ہونے کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے معاملات میں عجیب عجیب

رموز و اسرار مخفی ہیں اور ہر واقعہ عجیبیہ و حادثہ جدیدہ میں ایک نہیں بلکہ بیسوں لطائف مستور ہیں، جن پر آگاہ ہونا صاحبانِ بصیرت ہی کا کام ہے۔ پس مصلحتوں اور لطیفوں پر نظر کرنے سے تکلیف تکلیف نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس عالمِ فانی میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو جاہل و احمق شخص تشویش و اضطراب سمجھکر تعجب کرتا ہے اس کو صاحبانِ بصیرت ایسا ہی سمجھتے ہیں جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت خضر علیہ السلام کے ساتھ رہ کر ان واقعات پر تعجب ہوا تھا جن کا مفصل قصہ سورہ کہف میں مذکور ہے کہ دونوں حضرات ایک کشتی میں بیٹھے تو حضرت خضرؑ نے کشتی کا ایک تختہ پھاڑ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے تعجب کے ساتھ اعتراض کیا کہ یہ زیادتی آپ نے کیوں کی۔ پھر آگے چلے تو حضرت خضر علیہ السلام نے ایک نابالغ لڑکے کو مار ڈالا اس پر بھی موسیٰ علیہ السلام نے تعجب کے ساتھ اعتراض کیا کہ معصوم بچہ کا خون کرنا کیا جائز ہے؟ پھر آگے چلے اور ایک بستی میں پہونچے کہ وہاں کے رہنے والوں نے ان کے کھانے تک کی خبر نہ لی، صبح ہونے پر جب دونوں حضرات اس قصبہ میں نکلے تو ایک دیوار پر نظر پڑی جو گری پڑی تھی، حضرت خضرؑ نے اسے سیدھا کر دیا۔ موسیٰؑ کو پھر تعجب ہوا کہ ایسی بے مروت قوم کے ساتھ جس نے مسافروں کے خورد و نوش کی بھی خبر نہ لی، منت و احسان کرنا چاہیئے تھا غرض جب تین مرتبہ اعتراض پر اعتراض ہو چکا تو حسب قرارداد کے موافق حضرت خضر علیہ السلام سے مفارقت ہو گئی۔

حضرت خضر علیہ السلام کے افعال میں بظاہر نقصان و تکلیف تھی مگر حقیقت میں مخلوق کی بہبودی کا سبب تھے۔

یہ ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا ان واقعات پر تعجب کرنا محض اس وجہ سے تھا کہ ان اسرار و رموز سے واقف نہ تھے، جو ان واقعات میں مخفی تھے۔

چنانچہ جب حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان سے مطلع کر دیا کہ کشتی غریب ملاحوں کی تھی اور بادشاہِ وقت ظلماً صحیح و سالم کشتیوں کو ضبط کر رہا تھا۔ لہٰذا میں نے اس کشتی کو عیب دار کر دیا تاکہ مسکینوں کی صورتِ معاش ضبط نہ ہو جائے۔ اور وہ نابالغ بچہ جس کو میں نے قتل کیا ہے چونکہ فطرتاً بد دین پیدا ہوا تھا اور غالب اندیشہ تھا کہ بالغ ہو کر اپنے مسلمان ماں باپ کو گمراہ کرے گا کہ وہ شفقتِ مادری و پدری کی وجہ سے اس کا خلاف نہ کر سکیں گے۔ لہٰذا اس کا کام تمام کر دیا تاکہ اس کے بدلہ میں صابر ماں باپ کو دوسری اولاد ملے جو صالح و سعید ہو اور ذریعہ آخرت بنے۔

رہا دیوار کا قصہ سو وہ دیوار دو یتیم بچوں کی تھی جن کا نیک بخت باپ اس دیوار کے نیچے خزانہ دبا کر چھوڑ گیا اور اس کو خدا کے حوالہ کر گیا تھا۔ لہٰذا اس کو میں نے سیدھا کر دیا تاکہ بالغ ہو کر اپنا مال قبضہ میں لائیں اور دیوار گر جانے سے خزانہ اپنے حقداروں کے علاوہ دوسروں کے ہاتھوں نہ لگنے پائے تو اس وقت موسیٰ علیہ السلام کا تعجب رفع ہوا۔

ناگوار واقعات میں مصلحتِ خداوندی مضمر ہوتی ہے

اسی طرح ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ وہ جنگل میں رہتے تھے اور ایک گدھا پال رکھا تھا جس پر اسباب لادتے تھے اور ایک کتا رکھ چھوڑا تھا جو مکان کی حفاظت کرتا تھا اور ایک مرغ پال رکھا تھا جو اذان دیکر صبح سویرے سب کو جگا دیا کرتا تھا۔ ایک دن لومڑی آئی اور مرغ کو پکڑ کر لے گئی تو انکی بیوی رونے لگی کہ ہائے مرغ جاتا رہا۔ شیخ نے فرمایا کہ رو مت اسی میں بہتری ہو گی۔ اگلے دن بھیڑیا آیا اور ان کے گدھے کو مار گیا اس وقت بیوی پھر رنجیدہ ہوئی تو شیخ نے کہا اسی میں خیر پیوستہ تھی۔ لہٰذا رونے کی کوئی بات نہیں اسکے بعد دفعتاً گدھا مر گیا اور بیوی پھر غمگین

ہوئی اور اس وقت شیخ نے پھر بھی فرمایا کہ غم نہ کرو اسی میں بھلائی تھی۔ بار بار یہ سنکر بیوی کو تعجب ہوا کہ صریح نقصان ہو رہا ہے اور خاوند بھلائی بھلائی پکار رہا ہے۔ غرض صبح ہوئی تو دفعتاً غنیم کا ایک لشکر اس میدان میں لوٹنے کیلئے آپڑا، اور جتنے بھی گھروں کا ان کو پتہ چلا سب کو لوٹ لیا اور بجز ان بزرگ اور ان کی بیوی کے سب ہی کو گرفتار کر کے باندی غلام بنا کر لے گئے۔ اور مکان کا پتہ نشان دشمن کی فوج کو اس سے چلا کہ کسی کے دروازہ کا کتا آہٹ پا کر بھونکنے لگا اور کسی کا گدھا رینگنے لگا اور کسی کا مرغ اپنی بانگ بلند کر رہا تھا۔ اس وقت ان بزرگ نے اپنی بیوی سے کہا کہ دیکھا کہ اس بادیہ نشین کی بربادی کا سبب آج یہی جانور بنے۔ پس خدا کا کتنا فضل تھا کہ ہمارے تینوں جانور پہلے ہی مر گئے اگر آج وہ زندہ ہوتے تو ہم بھی دوسروں کی طرح دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے۔

ایک نبی کسی پہاڑ کی کھو میں بیٹھے عبادت کر رہے تھے اور پہاڑ کے قریب چشمہ تھا، جس پر بسا اوقات پیاسوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک سوار آیا اور اس نے نقدی کی ہمیانی کمر سے کھول کر زمین پر رکھدی اور پانی پینے لگا پانی پی کر وہاں سے چلدیا اور تھیلی بھول گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص آیا اس نے تھیلی کو اٹھا کر لے لیا اور چل دیا اور اسکے بعد ایک غریب مزدور سر پر لکڑیوں کا گٹھا لادے ہوئے آیا گٹھا زمین پر ڈال کر آرام لینے کیلئے چشمہ کے کنارے بیٹھ گیا، اتنے میں وہ سوار جس کی تھیلی رہ گئی تھی گھبرایا ہوا آیا اور تھیلی کو نہ پایا تو ادھر ادھر دیکھا اور جب کوئی آدمی نظر نہ آیا تو بیچارے اس مزدور کے سر ہو گیا۔ ہر چند اس نے انکار کیا کہ میں نے تھیلی کو دیکھا بھی نہیں مگر سوار کو یقین نہ آیا، یہاں تک کہ تلوار کو میان سے نکال کر غریب مزدور کی گردن اڑادی اور چلا گیا۔

تکوینی اسرار و حکم پر مطلع ہونا مشکل ہے

یہ حال دیکھ کر پیغمبر علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا یا الٰہا یہ نرالا واقعہ بھی کتنا عجیب ہے کہ تھیلی کسی نے لی اور مارا کوئی گیا۔ حکم ہوا کہ تم اپنا کام کرو تمہیں ہمارے ملکوتی اسرار میں دخل دینے کی حاجت نہیں۔ بات یہ ہے کہ اس مزدور نے اس سوار کے باپ کو مارا تھا لہٰذا آج اس کا قصاص لیا گیا کہ مقتول کے بیٹے نے اپنے باپ کے قاتل کو مار دیا اور اس سوار کے باپ نے ایک مرتبہ اس شخص کے مال میں سے ایک ہزار دینار لیے تھے جو کہ تھیلی لے گیا ہے۔ لہٰذا آج اس کی تلافی کی گئی کہ لینے والے شخص کی میراث میں سے ایک ہزار دینار کی تھیلی اس کو دلا دی گئی۔

الحاصل جو شخص اسرار تکوینیہ پر ایمان لائے ہوئے ہے وہ تو حق تعالیٰ کے احکام قضا و قدر پر ہرگز تعجب نہ کرے گا بلکہ اپنے تعجب کرنے پر تعجب کرے گا کہ شہنشاہی ملحتوں کے راز نہ سمجھنے پر غلام کو تعجب کیوں ہوا۔؟

رضا بر قضا کا صحیح مطلب

حق تعالیٰ کا جو کام بھی ہوتا ہے وہ پُر از مصالح و اسرار ہوتا ہے۔ اس پر کسی وقت بھی ناگواری ظاہر نہ کرنا چاہیئے کفر اور معصیت اس حیثیت سے کہ سب کچھ حق تعالیٰ کی طرف سے ہے اور قضا و قدر کے مطابق ہے اس کو برا نہیں کہا جاتا البتہ حق تعالیٰ کو چونکہ مبغوض ونا پسند ہے۔ اسی لئے تبلیغ کی جاتی ہے۔ رضا بر قضا یہ نہیں کہ دعا یا تدبیر اور اسباب اختیار کرنا چھوڑ دیا جائے۔ تیر انداز نے جو تیر تمہاری طرف پھینکا ہے۔ اس کو ڈھال پر روک لینے کی طاقت رکھتے ہوئے نہ روکو اور اپنے بدن پر لگنے دو اور یوں سمجھو کہ قضا پر راضی رہنا چاہیئے ایسا سمجھنا بھی جہالت اور خام خیالی ہے کیونکہ دعا مانگنے اور شر سے حفاظت و تدبیر کرنے کا شریعت حکم دے رہی ہے۔

اور محبوب کے حکم سے سرتابی ہے۔ لہٰذا یہاں رضا بر قضا کے معنی یہی ہیں کہ حق تعالیٰ نے کسی شئے کے حاصل ہونے کے لئے جو اسباب مقرر فرمائے ہیں۔ ان کو اختیار کرو تاکہ محبوب تم کو اپنے انتظام کا پابند دیکھ کر تم سے راضی ہو اور اگر اسباب کا اختیار کرنا چھوڑ دو گے تو محبوب کے مخالف کہلاؤ گے۔ مثلاً کوئی پیاسا آدمی پانی پائے مگر اس کی جانب ہاتھ نہ بڑھائے اور یوں گمان کرے کہ میں تو پیاس پر راضی ہوں کیونکہ پیاس حق تعالیٰ کے حکم اور قضا و قدر سے ہے اور قضا پر راضی رہنا ضروری ہے تو یہ شخص بے وقوف کہلائے گا اور اس کو سمجھایا جائے گا کہ کیا تو حق تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے اسباب اور عادتِ جاریہ میں رخنہ ڈالنا یا حدودِ شریعت سے باہر نکلنا چاہتا ہے۔ تو نے جو کچھ سمجھا یہ رضا کے معنی ہرگز نہیں ہیں رضا کے تو صرف یہ معنی ہیں کہ حق تعالیٰ پر ظاہر و باطن یا زبان یا دل کوئی بھی کسی حالت پر اعتراض نہ کرے بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کے حکم کی تعمیل بھی ہو اور جو انتظام اس نے عالم کے لئے تجویز فرما دیا ہے۔ اس سے بھی باہر نہ نکلے بلکہ شرعی احکام کا پورا پابند ہو اور جس طرح حق تعالیٰ کی مرضی ہے اس کے حاصل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی ایجاد نہ کرے مثلاً جب دعا کا حکم ہوا ہے تو اس کی تعمیل ہو تاکہ خشوع و خضوع اور قلب میں رقت اتر آوے اور وہ لیاقت و استعداد حاصل ہو جس کی وجہ سے قلب پر انوار و تجلیات کا ورود ہو سکے اسی طرح اسباب کو بھی اختیار کیا جائے تاکہ مسبب حاصل ہو البتہ اگر سبب کے بعد بھی مسبب حاصل نہ ہو تو کوئی خلجان پیدا نہ ہونا چاہیے اور نہ رنجیدہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ راضی رہے اور یوں سمجھے کہ سبب تو فی الحقیقت مؤثر تھا ہی نہیں اور حق تعالیٰ کا ارادہ یوں تھا کہ یہ مسبب مجھ کو حاصل نہ ہو پس قضا و قدر خداوندی پر مجھ کو راضی رہنا چاہیئے۔ لہٰذا اگر وہ شئی باوجود وسائل و اسباب اختیار کرنے کے بھی مجھے حاصل نہیں ہوتی تو یہ میرے حزن و غم یا شکوہ و شکایت کا سبب نہیں ہو سکتا۔

ذکر الموت

موت ایک ایسا یقینی امر ہے کہ اس میں کسی طرح بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔
حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (ہر ایک کو موت کا مزہ چکھنا ہے) درحقیقت آدمی کو بُرے کاموں سے روکنے اور نیک کاموں پر آمادہ کرنے والی چیز صرف موت اور زندگی ہی ہے۔
ارشاد خداوندی ہے۔ الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً ؕ یعنی حق تعالیٰ وہ ذات ہے کہ جس نے موت وحیات کو اس لئے پیدا کیا ہے تاکہ آزمائے کہ کون تم میں سے اچھے اور نیک اعمال کرتا ہے۔
اس آیت میں موت کو زندگی پر مقدم کیا گیا ہے تاکہ آدمی ہر دم موت کا خیال رکھے اور اس چند روزہ زندگی کو ہیچ سمجھے یا اس لئے مقدم کیا ہے کہ موت دراصل اس دنیا میں ذاتی اور حیات عارضی ہے۔ اور ذاتی عارضی پر مقدم ہوا کرتا ہے۔ اور یہاں پر اگر موت سے وہ حالت مراد لی جائے جو نطفہ میں تھی یعنی انسان جس وقت نطفہ تھا تب بھی موت کو حیات پر تقدم ہے۔ حیات تو حق تعالیٰ کی نعمت ہے ہی مگر اس دنیا میں موت بھی حق تعالیٰ کی برکات اور رحمتوں کا بہت بڑا مظہر ہے۔

کیونکہ اگر موت نہ ہو تو اول تو یہ قوائے جسمانیہ سو دو سو برس کے بعد بلکہ اس سے بھی پہلے بیکار ہو جائیں اور زندگی وبال جان بن جائے۔

دوسرا اس دنیا میں بہت سے لوگوں کی موت اوروں کے لئے راحت و چین کا باعث ہوتی ہے۔

تیسرے آخرت کی ابدی زندگی اس کڑوے پھل کے کھانے ہی پر موقوف ہے کہ ہر ایک کو اس پل سے گذرنا ہے۔

اولیاء اللہ کا قول ہے ان الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب یعنی موت ایک پل ہے کہ اس سے پار ہو کر ہی حبیب سے حبیب ملاقاتی ہو سکے گا۔ اور موت کے گھاٹ سے اتر کر ہی عالم فانی سے عالم جاودانی میں جاتا اور نیک و بد کی جزا و سزا پاتا ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ تاکہ تم کو آزمائے کہ کس کے عمل اچھے ہیں۔ درحقیقت یہ دنیا ایک کھیت ہے جس نے نیک کاموں کا تخم بویا ہے وہ اس جہاں میں اس کے عمدہ پھل پاوے گا اور برکت حاصل کرے گا۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت جان

۱۔ بڑھاپے سے پہلے جوانی کو

۲۔ بیماری سے پہلے تندرستی کو

۳۔ فقیری سے پہلے تونگری کو۔

۴۔ موت سے پہلے زندگی کو

۵۔ مشغولیت سے پہلے فراغت کو۔

نیز قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ عجلوا بالتوبۃ قبل الموت و عجلوا بالصدقۃ قبل تحویل المال وعجلوا بتزویج البنات قبل الفضیحۃ وعجلوا بدفن المیت قبل الحدث وعجلوا بالصلوٰۃ قبل الفوت وعجلوا باستعداد الموت قبل نزول ملک الموت وعجلوا باعمال الصالحۃ قبل فناء العمر وعجلوا بارضاء الخصوم قبل الندامۃ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں الموت آخر یوم من ایام الدنیا واول یوم من ایام الاخرۃ ۔۔ یعنی موت دنیا کے دنوں کا آخری دن اور آخرت کے دنوں کا اول روز ہے۔

موت سے فرار موجب غفلت ہے اور جو شخص ذکر موت کا مشتاق ہوتا ہے اس کو دنیا میں قیام کرنا نہایت شاق گزرتا ہے۔ بلکہ وہ اکثر موت کا منتظر رہتا ہے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللّٰھم حبّب الموات الی من یعلم انی رسول اللہ اے اللہ اس شخص کو موت کا مشتاق کر دے جو میری نبوت پر ایمان رکھتا ہے۔ غور کرو کہ جس موت سے آدمی بھاگتا ہے اس کو یہ فرار کسی درجہ میں بھی نصیب نہیں کیونکہ وہ تو اپنے وقت پر ضرور آئے گی۔ موت وحیات تو حق سبحانہٗ نے اسی لئے بنائی ہے کہ آدمی کا مطیع اور عاصی ہونا ظاہر ہو جائے۔ کیونکہ دنیا کی یہ چند روزہ زندگی تکلیف کا مدار ہے۔ لہذا موت سمجھدار آدمی کے لئے بہت بڑا وعظ ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ ہر وقت اپنی موت کو پیش نظر رکھے اور اس ناپائیدار زندگی کو بجز طاعت اور اعمال نیک کے فضولیات، لغویات اور دنیا طلبی میں نہ گزارے اور اس دنیا کو آخرت کی نعمتوں سے مالا مال کرے اور اس کو آخرت کی کھیتی سمجھ کر اپنا

بیج بوئے کہ مرنے کے بعد آخرت میں اس کا ثمرہ اٹھائے اور ابدی زندگی حاصل ہو۔ موت سے غفلت اور اپنے اعمال کی جزا و سزا سے لاپرواہی انتہائی حماقت اور بیوقوفی کی بات ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے یہ فرما کر کہ دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو جس طرح مسافر ہوتا ہے بلکہ پل سے گزرنے والا ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا اپنے آپ کو اصحابِ قبور میں شمار کرو۔ وعد نفسك من اصحاب القبور۔

خاتمہ

حق تعالیٰ نے سات کے عدد کو ایک خصوصیت دے رکھی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کی سات منزلیں ہیں۔ سورۃ فاتحہ میں سات آیات ہیں۔ ہفتہ میں سات رات اور سات دن ہیں اور کائنات میں سات زمین اور سات آسمان ہیں۔ میں نے بھی اسی وجہ سے اس کتاب میں سات ابواب قائم کئے ہیں تاکہ اس کے ساتھ ایک گونہ مناسبت پیدا ہو جائے۔

اب ان ابواب سبعہ کے خاتمہ پر چند ضروری فوائد اور تصوف و سلوک کی کسوٹی اور میزان کے طور پر خاتمہ لکھا ہے۔ تاکہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے اور میدان سلوک میں گامزن ہونے والے حضرات اس کو اپنے لئے شاہراہِ عمل بنائیں۔ یہ مقامات تصوف ہیں جن کا تصوف سے خاص تعلق ہے:

۱۔ مقام، جو خواب یا کشف یا الہام یا غیبی آواز، قرآن و حدیث کے مطابق ہے تو وہ قابلِ اعتنا اور لائق عمل ہے اور اگر خلاف ہے تو ترک کر دینے کے قابل ہے۔

۲۔ مقام۔ بھوک و پیاس اور بے سروسامانی میں قناعت و توکل اور محبت خدا میں وجد و تواجد اور جوش و خروش ہو تو یہ قابل اعتبار اور لائق شکر ہے اور

عمدہ ولذیذ کھانے اور مال واسباب وافر موجود ہونے کی حالت میں قناعت و توکل ہو اور وجد و تواجد معلوم ہو تو یہ نفس کا دھوکہ اور محض ایک ذاتی خیال ہے۔

۳۔ مقام: قرآن پاک خوش الحان قاری پڑھے یا بلا مزامیر بوڑھا یا جوان حمد و نعت کے اشعار پڑھے اور اس کے سننے سے وجد و تواجد اور دل کو راحت نہ ہو اور عورت یا مرد کے اشعار پڑھنے یا مزامیر کی آواز کے ساتھ کسی کو حال طاری ہو تو سمجھ لو کہ یہ حال نہیں بلکہ وبال ہے۔

۴۔ مقام: کسی شخص کو کشف ہو یا طے ارض ہو یا کچھ بھی ہو اگر اس کے دل میں امید یا خوفِ غیر ہے تو نہ وہ ولی اللہ ہے اور نہ اس کا سلوک قابلِ اعتبار ہے۔

۵۔ مقام: جس طرح دوسرے لوگ اس کی جسمانی خدمت، کفش برداری اور روپیہ پیسہ سے مدد کرتے ہیں اسی طرح اپنے سے کم درجہ کے لوگوں کی خدمت کرنی چاہیئے یہی عین طریقت ہے۔

۶۔ مقام: اپنی تعظیم و تکریم کو صحیح اور ضروری سمجھ کر اس سے لوگوں کو منع نہ کرنا اور خود دوسروں کی تعظیم و تکریم یا خدمت گذاری سے گریز کرنا، شانِ اسلام اور شانِ ولایت کے خلاف ہے۔

۷۔ مقام: کشف و کرامات کا خواہشمند یا کیمیا اور دستِ غیب کا طالب طالبِ خدا نہیں۔

۸۔ مقام: اپنے عیوب کو پیش نظر رکھنا اور دوسروں کے عیبوں کو چھپانا یا تلاش نہ کرنا اچھی خصلت اور قابلِ شکر ہے۔

۹۔ مقام: مسائل شرعیہ میں ائمہ فقہ کی تقلید اور مسائلِ طریقت میں ائمہ

طریقت کی پیروی نہایت ضروری ہے اور اس کے خلاف میں تباہی اور گمراہی ہے بجز اس شخص کے جو مرتبۂ اجتہاد کو علم شریعت یا طریقت میں پہونچ چکا ہو۔ لیکن وہ بھی اگر تقلید ائمہ کرے تو یہ نہایت احسن اور احوط ہے۔

۱۰۔ مقام: ذکر قلبی بعض اوقات اس قدر لطیف ہوتا ہے کہ اس کا ادراک نہیں ہوتا اور بعض اوقات کسی گناہ کی وجہ سے ذکر نہیں ہوتا۔ پس اس کی شناخت کا طریقہ یہ ہے کہ اگر دل میں توحیدِ الٰہی اور محبت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہے تو سمجھ لے کہ دل میں ذکر لطافت کے ساتھ موجود ہے اور توحید اور محبتِ رسول میں کمی محسوس ہو تو یہ قبض بوجہ گناہ ہے۔ اس وقت استغفار اور گریہ وزاری زیادہ کرنا چاہیئے۔

۱۱۔ مقام: جس طرح آدمی کو اپنی عورتوں کے پردہ اور عصمت کا خیال ہوتا ہے اسی طرح دوسروں کا بھی خیال رکھنا چاہیئے۔ حدیث کا ترجمہ ہے:

ہر چہ بخود نہ پسندی بدیگراں مپسند۔

۱۲۔ غیر محرم عورتوں کی مجلس اور جس مقام پر فحش کلام یا ناجائز کام ہوتے ہوں وہاں سے بچنا چاہیئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اتقوا بمواقع التُہم یعنی تہمت کی جگہ سے دور رہو۔

۱۳۔ مقام: ایسے عرسوں میں سفر کرکے ہرگز نہ جانا چاہیئے کہ راستے میں نمازیں قضا ہوں یا روپیہ قرض لیکر جاتا ہو یا اہلِ حقوق، ماں، باپ، بیوی بچے تکلیف پائیں۔ یا وہ بیمار ہوں۔ عرس میں اگر منہیات شرعیہ نہیں ہیں تو اس میں شریک ہونا بعض کے نزدیک یہ جائز ہے۔ فرض یا واجب یا سنتِ مؤکدہ نہیں ہے اور اہل حقوق کے حق کی ادائیگی فرض اور واجب ہے اور یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کہ فرض یا واجب

یا سنت کے مقابلہ میں مستحب قابل ترک ہوتا ہے۔ حج بیت اللہ بھی اسی وقت فرض ہوتا ہے جبکہ اہل حقوق سے زائد اور فاضل روپیہ موجود ہو جبکہ بیت اللہ شریف کا حج ہی ایسی حالت میں فرض نہیں ہوتا تو ایک امر مستحب یا جائز میں جانا کس طرح درست ہوگا۔

۱۴۔ مقام: اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے اکل حلال حاصل کرنا فرض ہے خواہ وہ بذریعہ تجارت و سوداگری ہو یا زراعت یا صنعت و حرفت یا ملازمت ہو اور یہ سنت ہے۔ انبیاء علیہم السلام و صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور اولیائے عظام رحمہم اللہ کی لہٰذا اس کو ہرگز ہاتھ سے نہ دینا چاہیئے۔ اور ان کاموں میں مشغول ہونے کے بعد خدا پر توکل ہونا چاہیئے۔

۱۵۔ مقام: تکلیف و راحت، تنگی و کشادگی اور غصہ و خوشی اور اپنے جملہ حالات میں ذکر قلبی پر نظر رکھے اگر دل میں ذکر پائے تو حق تعالیٰ کا شکر بجا لائے۔ اور اگر غافل پائے تو ندامت اور افسوس کرے۔

۱۶۔ مقام: اچھا کھانے یا اچھا پہننے کا نفس کو عادی نہ بنائے اور نہ عمدہ کھانے کو بے مزہ کر کے کھائے، نہ اس قدر زیادہ کھائے کہ بدہضمی و کسل ہو۔ اور نہ اتنا کم کھائے کہ ضعف پیدا ہو کر اہل و عیال کی خدمت و اتباع سنت سے محروم رہے۔

۱۷۔ مقام: نہ اتنی زیادہ گفتگو کرے کہ سامعین پریشان اور ملول خاطر ہو جائیں اور نہ اتنی خاموشی اختیار کرے کہ آنے والے بیزار ہو جائیں۔ نہ مالداروں اور دنیا داروں کے پاس اس قدر بیٹھے کہ دل مُردہ ہو جائے۔ اور اتنا نہ دور بھاگے کہ ہدایت کا دروازہ بند ہو جائے۔

۱۸۔ مقام: رات کو اس قدر نہ جاگے کہ دماغ اور اعضاء بیکار ہو جائیں اور

نہ اتنا سووے کہ دنیا و عقبیٰ برباد ہو جائے۔

۱۹۔ مقام؛ سالک کو چاہیئے کہ نہ کسی پر طعن کرے، نہ کسی کی غیبت کرے۔ اور نہ کسی سے اپنے کو بُرا سمجھے، نہ اپنے کو کسی کے مقابلے میں اچھا جانے اور نہ کسی کا دل دکھاوے۔ یہ سب چیزیں مذموم ہیں اور ارشاد و طلب خدا کے خلاف ہیں۔

مباش در پئے آزار ہر چہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہ نیست

۲۰۔ مقام: مزارات اولیاء اللہ پر با ادب حاضر ہونا چاہیئے اور ان کی روح مبارک سے فیض حاصل کرنا اور ان کی ذات بابرکات کے توسل سے حق تعالیٰ کی جناب میں فتوحات دارین کی دعا کرنا چاہیئے۔ طواف و سجدہ زندہ اولیا ہوں یا ان کی قبروں پر کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جو امام الطریقہ ہیں وہ اپنی مشہور کتاب غنیتہ الطالبین، جلد اول، کتاب الاداب صفحہ ۳۵ مصری میں یہاں تک احتیاط فرماتے ہیں کہ جب کسی قبر کی زیارت کرو تو نہ اس پر ہاتھ رکھو اور نہ اس کو بوسہ دو کہ یہ یہودیوں کا طریقہ ہے اور اسی طرح امام محمد غزالیؒ اور مجدد الف ثانی بھی فرماتے ہیں۔

۲۱۔ مقام؛ شریعت نسخہ ہے، طریقت دوا ہے، حقیقت پرہیز ہے اور معرفت شفا ہے۔

۲۲۔ مقام؛ شریعت علم ہے۔ طریقت عمل ہے۔ حقیقت خلوص ہے اور معرفت دیدار حق ہے۔

۲۳۔ مقام: شریعت رہنما ہے۔ طریقت راستہ پر چلنا ہے۔ حقیقت مقام مقصود تک پہونچنا ہے۔ اور معرفت صاحب مکان سے ملنا ہے۔

۲۴۔ مقام: شریعت مثل جسم کے ہے، طریقت مثل جان کے ہے۔ اور شریعت عمل ہے اور طریقت اس میں خلوص ہے۔

۲۵۔ مقام: ہر شخص اپنا کف نگل جانے پر اور اپنے فضلہ کو دیکھ کر یا اپنی بدبو سے اس قدر متنفر نہیں ہوتا جتنا کہ دوسرے کے تھوک سے ہوتا ہے اسی طرح اپنے برے اور خراب اعمال سے اتنی بے زاری نہیں ہوتی جس قدر دوسروں کے برے اعمال سے ہوتی ہے۔ یہ امر نہایت بے انصافی اور نفس کا دھوکہ ہے اس سے بچنا اور من عمل عملاً صالحاً فلنفسہ ومن اساء فعلیھا کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

۲۶۔ مقام: جب تک صوفی اپنے آپ کو کافر فرنگ اور خبیس کتے سے بدتر نہ جانے گا، معرفتِ حق اس پر حرام ہے اور کیا حال ہے اس شخص کا جو اپنے کو بزرگانِ دین کے برابر جانتا ہے۔

۲۷۔ مقام: نبوت کے واسطے معجزہ لازمی ہے اور ولایت کے لیے کرامت لازمی نہیں ہے اور ولی کو اتباع نبی ضروری اور لازمی ہے۔

۲۸۔ مقام: صوفیہ کے سلوک سے ہرگز یہ مقصود نہیں ہے کہ غیبی صورتوں اور شکلوں کا مشاہدہ کریں اور الوان و انوار کو دیکھیں۔ یہ باتیں خود لہو ولعب میں داخل ہیں۔ ان کو تصوف سے تعلق نہیں۔

۲۹۔ مقام: جس دل میں مال و جاہ کی محبت ہے وہ دل نزولِ رحمت کے لائق نہیں اور وہ دل حقیقت میں دل ہی کہلانے کے قابل نہیں۔

۳۰۔ مقام: جس نے خدا کو پہچانا اس نے اولیاء کو جانا اور جس نے اولیاء کو پہچانا، اس نے درحقیقت خدا کو جانا۔

۳۱۔ مقام: جس نے وصول الی اللہ کا خیال پختہ کر لیا وہ ضرور واصل ہوگا۔ اور جس نے اپنے آپ کو دور جانا وہ قریب ہوا۔

۳۲۔ مقام: ادراک سے عاجز ہونا درحقیقت ادراک ہے اور اپنی جہالت کا اقرار کرنا معرفت ہے۔

۳۳۔ مقام: شریعت کے تین جز ہیں۔ علم، عمل اور اخلاص جب تک یہ تینوں جز متحقق نہ ہوں شریعت متحقق نہیں ہوتی۔

۳۴۔ مقام: ہر عمل کا دارومدار دل پر ہے اگر کسی کا دل غیر سے گرفتار ہے تو وہ نہایت خراب اور ابتر ہے۔ صرف ظاہری اعمال اور رسمی عبادتوں سے کچھ نہیں ہوتا اور بغیر اعمال صالحہ بدنی کے جن کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ سلامتی دل کا دعویٰ کرنا محض باطل اور غلط ہے۔

۳۵۔ مقام: علم و عمل دراصل شریعت سے حاصل ہوتے ہیں اور اخلاص کا حاصل ہونا طریقۂ صوفیہ پر منحصر ہے کہ جو علم و عمل کی روح ہے۔

۳۶۔ مقام: یاد کرد طریقت میں ہے اور یادداشت حقیقت میں ہے۔

۳۷۔ مقام: تواضع دولت مندوں کے لئے ثمرہ فضیلت ہے اور استغنا فقراء کو زیبا ہے۔

۳۸۔ مقام: قلب کی سلامتی نسیان ماسوی اللہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

۳۹۔ مقام: جملہ سعادتوں کا سرمایہ سنت نبوی کی تابعداری ہے اور تمام فساد دل

اور خرابیوں کی جڑ شریعت کی مخالفت ہے۔

۴۰۔ مقام: فقراء کی خاک روبی دولت مندوں کی صدر نشینی سے بہتر ہے۔

۴۱۔ مقام: جو مرنے سے پہلے نہ مرا وہی ماتم پرسی کے لائق ہے اور جو مرنے سے پہلے مرگیا اس کا یہ مرنا ان کے لئے درحقیقت باعثِ خوشی اور دوسروں کیلئے باعث غم ہے۔

۴۲۔ مقام: منازلِ سلوک دراصل اس لئے ہیں کہ ایمان حقیقی نصیب ہو جائے۔

۴۳۔ مقام: طریقہ سلاسل کا دار ومدار دو اصولوں پر ہے۔ ایک شریعت کی پیروی استقامت کے ساتھ دوسرے شیخ طریقت کی محبت اور اخلاص میں استقامت۔

۴۴۔ مقام: جب تک خاتمہ بخیر نہ ہو مبشرات والہام یا کشف وکرامات یا کسی حال پر مطمئن نہ ہونا چاہیئے اور ہمیشہ دربارِ خداوندی میں گریہ وزاری اور بیقرار رہنا چاہیئے۔

۴۵۔ مقام: اللہ تعالیٰ بیچون وبیچگون اور وراء الوریٰ ہے اور جو کچھ بھی دید ودانش اور شہود ومکاشفہ میں آئے وہ سب اس کا غیر ہے۔ اس راہ کے جوز ومویز پر بچوں کی طرح فریفتہ نہ ہونا چاہیئے۔

۴۶۔ مقام: انسان آئینۂ کامل ہے اگر یہ اپنے آئینہ کا رخ عالم دنیا کی طرف رکھے تو عکس خراب پڑ کر نہایت مکدر اور بدنما ہو جائے گا اور اگر آئینۂ قلب کا رخ حق تعالیٰ کی طرف کرے تو سب سے زیادہ مصفا اور خوشنما ہو جائے گا۔

۴۷۔ مقام: جب تک سالک حیرت اور فنا میں نہ پہونچے گا فنا نصیب نہیں ہوگی۔

۴۸۔ مقام: فقراء اور اولیاء اللہ کی محبت دنیا وآخرت کا بہترین سرمایہ ہے۔

۴۹۔ مقام : انسان درحقیقت جمیع موجودات کا جامع ہے۔ اس لئے تمام موجودات سے اس کا تعلق اور علاقہ ہے۔ اگر یہ دنیا کی چیزوں کے تعلق ہی میں پھنس گیا تو فقد ضلّ ضلالاً بعیدا اس کے نصیب میں ہے اور عالم ارواح و اسماء و صفات و ذات قدس کی طرف مخاطب ہو گیا تو فقد فاز فوزا عظیما اس کے حصہ میں ہے۔

حالات و اقوال ائمہ طریقت رحمہم اللہ

اب ہم چاروں ائمہ طریقت کے احوال مختصراً درج کتاب کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے ذکر سے برکت حاصل ہو ورنہ ان بزرگوں کے قرب الٰہی اور مرتبہ علیا کا حال تو حق تعالیٰ شانہ ہی خوب جانتا ہے۔ یہ چاروں بزرگ اپنی اپنی شان میں یکتا و بے مثال ہیں اور اس مصرع کے مصداق ہیں۔ سے

ہر گلِ را رنگ و بوئے دیگر است

مجبوب سبحانی قطب ربانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ

علم طریقت کے سب سے پہلے امام ہیں جس طرح علم شریعت میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے یہی وجہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کو لفظ اعظم سے یاد کیا جاتا ہے اور چونکہ ہر دو ائمہ نے علم فقہ اور علم طریقت کی بنیاد رکھی ہے بمقتضاء الدال علی الخیر کفاعلہ تمام فقہاء کے علم و عمل کا اجر عظیم امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پانے کے مستحق ہیں۔ اور حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ طریقت کے علم و عمل کا اجر پانے کے مستحق ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی ذات بابرکات حق تعالیٰ نے شانِ

عبودیت عنایت فرمائی تھی۔ آپ سے جس قدر کرامات اور خرقِ عادات کا ظہور ہوا ہے۔ امت مسلمہ میں کسی ولی اللہ سے اس قدر کرامات ظاہر نہیں ہوئیں آپ کے لفظ لفظ میں اللہ تعالیٰ نے تاثیر اور کرامت رکھی تھی۔ آپ کے سلسلہ میں لاکھوں اولیاء اللہ ہو گئے اور انشاء اللہ قیامت تک ہوتے رہیں گے۔

آپ کے کلمات

اے عزیزو! یاد رکھو کہ محض زبانی علم بدون عمل قلب کے تجھ کو حق کی طرف ایک قدم بھی نہیں چلائے گا۔ درحقیقت قلب کی رفتار ہی رفتار ہے اور قرب باطن ہی قرب ہے اور عمل معانی ہی کا عمل ہے۔ بشرطیکہ اعضاء ظاہریہ سے شریعت کے حدود کی محافظت ہو۔

اے عزیز!۔ اس سے بچ کہ حق تعالیٰ تیرے قلب میں اپنے غیر کو دیکھے۔ پس تو ذلیل و خوار ہو تو اس سے بچ کہ وہ تیرے قلب میں اپنے غیر کا خوف یا غیر سے توقع یا غیر کی محبت ملاحظہ فرمائے۔ ان لوگوں کے میل جول کو چھوڑ جو تجھ کو دنیا کی طرف بلائیں اور رغبت دلائیں اور ان کی ہمنشینی تلاش کر جو تجھ کو اس سے بے رغبت بنائیں جو شخص اللہ عزوجل اور اس کے نیک بندوں کے ساتھ اچھا اور نیک گمان نہ رکھے۔ اور ان کے سامنے تواضع نہ کرے اس کو فلاح نصیب نہ ہوگا۔

اے شخص! تو ان کے سامنے تواضع کیوں نہ کرے حالانکہ وہ سردار اور امیر ہیں۔ ان کے مقابلے میں تیری کیا ہستی ہے۔ حق تعالیٰ نے انتظام ملکی ان کے حوالہ کیا ہے انکی بدولت آسمان بارش برساتا ہے اور زمین میں سبزہ اگتا ہے۔

شجاعت اور بہادری دین کے بارہ میں اور حقوق الٰہیہ کے ادا کرنے میں ہوا کرتی ہے۔ حکماء اور علماء کے کلام کو حقیر مت سمجھو کہ ان کا کلام دوا ہے اور ان کے کلمات

حق تعالیٰ کی وحی کا ثمرہ ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والوں کی تابعداری کرتا گویا کہ حضرت ہی کا اتباع ہے۔ اور ایسے لوگوں کو دیکھنا گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو دیکھنا ہے۔ جنّت کی کنجی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہَ کہنا ہے۔ مگر نہ صرف زبان سے بلکہ اپنے دل سے جو شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع نہ کرے اور اپنے ایک ہاتھ سے آپ کی شریعت کو اور دوسرے ہاتھ میں آپ کی لائی ہوئی کتاب قرآن پاک کو نہ تھامے اور آپ کے بتائے ہوئے راستہ پر حق کی طرف نہ چلے وہ ہلاک ہوا یہی دونوں قرآن و شریعت حق تعالیٰ کی طرف راستہ چلانے والے ہیں۔ قرآن تیرا رہبر ہے، حق تعالیٰ تک پہونچانے کو اور سنت تیری راہبر ہے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچانے کو۔ آپ کی وفات ۹ ربیع الآخر ۵۶۱ھ ہوئی اور بعض کے نزدیک ۱۷ ربیع الآخر آپ کی تاریخ وفات ہے اور آپ کا مزارِ مقدس شہر بغداد میں ہے۔

مختصر حالات

امام الطریقہ سلسلۂ چشتیہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت اقدس کی ذات گرامی حق تعالیٰ کی نعمتوں سے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہی وہ بزرگ ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان میں نورِ اسلام پھیلا اور درحقیقت آپ کا سرزمینِ ہند میں قدم رکھنا اسلام کی ترقی کا باعث ہوا اور حق تعالیٰ نے انھیں کے نور باطن، تصرفات، کرامات اور جہاد سے ہندوستان جیسے کفرستان کو منور اور روشن کیا اور یہاں کے مسلمانوں کی یہ بھی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ آپ کی قبر شریف بھی ہندوستان میں بمقام اجمیر شریف بنی جس کی وجہ سے اجمیر کا شہر شریف کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔

آپ کے بڑے بڑے جلیل القدر خلفاء ہندوستان میں ہیں، جن کے نور باطن سے سرزمین ہند نور اسلام سے منور ہے۔ جیسے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ۔ حضرت فریدالدین گنج شکرؒ حضرت جمال الدین ہانسویؒ۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ حضرت مخدوم علی احمد صابری کلیریؒ۔ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ آپ کی کیا تعریف کی جاسکتی ہے کہ جن کی پیشانی پر انتقال کے وقت غیب سے لکھا گیا حبیب اللہ مات فی حب اللہ۔ اللہ کا دوست اللہ کی محبت میں مرگیا۔ آپ کے پیر و مرشد حضرت عثمان ہارونؒ اور آپ کے خلفاء کے احوال

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ اور ان کے صحبت یافتہ غایت درجہ کے متبع سنت اور اعلیٰ درجہ کے اتقی تھے۔ چونکہ ان حضرات کی نسبت میں شورشِ عشق ہے اس وجہ سے یہ حضرات گاہے گاہے کلام عاشقانہ اور توحید جوان یا بوڑھے کسی متشرع آدمی سے سن لیا کرتے تھے کہ جس کے سننے میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کا سماعِ جائز کے سننے ہی میں انتقال ہوا ہے۔

خاندان چشتیہ کے جو لوگ غلام ہیں ان کا فرض ہے کہ اپنے امام طریقت اور انکے خلفاء کی تقلید کریں تاکہ وصول الی الحق کی دولت سے مالا مال ہوں اور جس طرح انھوں نے سماع سنا ہے اور جتنے عرصہ کے بعد سنا ہے اور جتنی جتنی دیر سنا ہے اور جس مقام قربِ حق میں پہونچنے کے بعد سنا ہے اسی طریقہ پر اگر کوئی سننا چاہے تو سنے لیکن ساتھ ہی اس کے یہ بھی کرنا چاہیئے جس قدر ان بزرگوں نے ریاضت اور یادِ خدا اور ترک دنیا کی ہے۔ اسی قدر تمہیں بھی کرنا چاہیئے یہ بات انصاف اور عقل سے بالکل بعید ہے کہ بوقت عبادت غائب بوقت ترک دنیا غائب بوقت ریاضت غائب اور بوقت سماع اور وہ بھی امام الطریقۃ رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف غنا میں حاضر جبکہ امام الطریقۃ خود امام الشریعت کے مقلد ہیں اور امام الشریعت کے خلاف کرنے کے وہ خود مجاز نہیں ہیں تو ہم جیسے ادنیٰ سے ادنیٰ امام الشریعت کے خلاف کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں اور قربِ حق کا کیا خیال پکا سکتے ہیں بلکہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے صحیح مصداق ہیں۔ ؎

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی	کیں رہ کہ تو می روی بترکستان است
مجھے خوف ہے کہ تو اے اعرابی کعبہ تک نہ پہونچے	کیونکہ تو جس راستہ پر جارہا ہے وہ ترکستان جاتا ہے

اگر امام الطریقت کے برابر عبادت و ریاضت اور ترک دنیا نہیں کرسکتے تو مت

کرو جس قدر تم سے ہو سکے اسی قدر کمی کے ساتھ کرو لیکن اسی اندازہ کی عبادت وریاضت اور ترک دنیا زہد وورع وتقویٰ کے سماع بھی کمی کے ساتھ سنو۔ حق تعالیٰ ان بزرگوں کے طفیل سے ہم جیسے لوگوں کو عقل سلیم اور صراط مستقیم عنایت فرمائے۔ آپ کی وفات ۶؍رجب المرجب ۶۳۳ھ کو ہوئی۔

مختصر حالات و کلمات

حضرت شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ طریقۂ سہروردیہ کے امام ہیں اور حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے پیر و مرشد ہیں جن کے حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ جیسے خلیفہ و مجاز طریقت ہوں ان کی تعریف عیاں راچہ بیاں آپ کی کتاب عوارف المعارف، علم تصوف میں ایک عجیب اور لاجواب تصنیف ہے۔ یہ کتاب صوفیہ کیلئے گویا دستور العمل ہے۔ اس میں اسرارِ طریقت اور نکات شریعت بیان کئے گئے ہیں۔ گویا رہروانِ طریقت کے لئے مشعل راہ ہے۔ آپ کے کلمات نصیحت آمیز بہت تھوڑے اور معناً نہایت وسیع ہیں اور مغز شریعت اور جان طریقت ہیں بطور نمونہ دو اشعار جن کو شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے ملاحظہ فرمائیے

مرا پیر دانائے مرشد شہاب — دو اندرز فرمود بر روئے آب

مجھے میرے پیرِ کامل شہاب الدین نے — دو نصیحتیں کیں نہر دجلہ پر کشتی میں

یکے آنکہ بر خویش خود بیں مباش — دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش

ایک تو یہ کہ تو اپنے آپکو بڑا مت سمجھ، دوسرے یہ کہ دوسرے کے بارے میں برا خیال مت رکھ۔

آپکی وفات غرہ محرم الحرام ۶۳۲ھ میں ہوئی اور آپکا مزار شریف بغداد میں ہے۔

مختصر حالات و کلمات

امام الطریقت خواجۂ خواجگان حضرت خواجہ محمد نقشبند رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ محمد نقشبند رحمۃ اللہ علیہ درحقیقت پیدائشی ولی تھے۔ آپ کو حق تعالےٰ نے صفت اجتبائیں سے حصہ دیا تھا۔ بچپن میں ہی آپ سے خرق عادات اور مکشوفات کا ظاہر ہونا شروع ہو گیا تھا۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ چند آدمی آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ بعض اولیا جسم خاکی کے ساتھ ہوا پر اڑتے ہیں۔ آپ نے یہ سن کر ایک زنبیل میں مٹی بھر کر زنبیل سے فرمایا بپرواز یعنی اڑجا، وہ زنبیل ہوا پر اڑ گیا۔ پھر آپ نے فرمایا بیا یعنی آجا وہ زنبیل ہوا پر سے آ گیا۔ اسی طرح چند مرتبہ آپ نے کیا۔ پھر ان لوگوں سے فرمایا۔ ہیچ کمال نیست یعنی کچھ کمال کی بات نہیں ہے۔

ایک روز جنگل میں ہرن جا رہے تھے۔ آپ نے آواز دی بیائید یعنی ادھر آؤ، وہ سب ہرن آپ کی آواز سنتے ہی فوراً حاضر ہو گئے۔ پھر فرمایا بروید یعنی جاؤ یہ سنکر وہ سب چلے گئے درحقیقت آپ کی ذات بابرکات سے ہزاروں کرامتیں ظاہر ہوئی ہیں جو ضخیم کتابوں میں مذکور ہیں۔ لیکن ان کرامات اور خرقِ عادات میں سب سے بڑی اور عظیم کرامت حضرت خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ تعالیٰ کی یہ ہے کہ لاکھوں مردہ قلوب کو

ذکرِ حق سے زندہ کر دیا اور ایسا نقش قلوب مومنین پر حضرت خواجہؒ نے حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے قائم کیا کہ وہ نقش پھر نہ مٹا اور وہ قبر میں ساتھ گیا۔ تمام اولیاء اللہ کے نزدیک یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ کرامت' مردہ کو زندہ کرنے سے مردہ دل کو زندہ کرنے کی بہتر اور اعلیٰ ہے کیونکہ اگر مردہ زندہ ہو گیا تو وہ دنیا سے قریب ہوا اور پھر اس کو موت ہے۔ اور جس کا دل زندہ ہوا وہ خدا سے قریب ہوا اور اسکو موت نہیں۔ درحقیقت حضرت خواجہ محمد نقشبندؒ کی تعریف کیا کی جا سکتی ہے۔ ان کے اظہارِ مرتبہ کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ان کے خلفاءِ سلسلہ خواجہ علاؤالدین عطارؒ حضرت محمد پارساؒ حضرت یعقوب چرخیؒ حضرت مولانا جامیؒ حضرت مجدد الف ثانیؒ حضرت خواجہ باقی باللہؒ جن کی ایک توجہ سے نان بائی درجۂ کمال کو پہونچا اور صورت و شکل و لباس اور نقشہ جسم پلٹ کر تمام کا تمام حضرت خواجہ جیسا ہو گیا۔ یہ سب کمالات و برکات حضرت خواجہ باقی باللہ کے دراصل فیضان اور کمال حضرت خواجہ محمد نقشبند رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کا ہے۔

حضرت خواجہ سے اگر کوئی دریافت کرتا کہ کونسی چیز آپ کو خدا تک لے گئی تو آپ فرماتے کہ مجھ کو جذب ربانی کھینچ کر لے گیا۔ آپ سید ہیں لیکن آپ کے یہاں عمدہ عمدہ کپڑے بنے جاتے تھے۔ اور ان کپڑوں میں نقش و نگار خوبصورت اور نفیس بنائے جاتے تھے کہ وہ کبھی نہ مٹتے تھے اور نہ ماند ہوتے تھے۔ اسی طرح یادِ حق کا نقش دلوں پر ایسا ڈھتے تھے کہ وہ کبھی خراب ہوتے اور نہ مٹتے' اسی واسطے اس سلسلہ کا نام نقشبندیہ جاری ہوا۔ حضرت خواجہ کے حالات اور کرامات کے سلسلے میں صرف حضرت سعدیؒ کے اس شعر پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ اس بحرِ ذخار کے حالات میں مطول اور ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں   بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

نہ انکی خوبیوں کی کوئی انتہا ہے نہ سعدی کے کلام کا کچھ ٹھکانہ   مریض جلگندر یونہی پیاسا مرجاتا ہے اور دریا ویسا کا ویسا باقی رہتا ہے

آپ ۶۰۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۳ ربیع الاول ۶۹۱ھ میں بروز دوشنبہ آپ کی وفات ہوئی اور مزار شریف آپکا شہر بخارا میں ہے۔

زبدۃ السلف قدوۃ الخلف حضرت مولانا الحاج السید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے احوال

مرشدی و مولائی حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی طاب اللہ مثورہ فی الجنۃ ۱۹ ر شوال المکرم ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ء کو شب سہ شنبہ میں ۱۱ بجے بانگ مئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے۔

یہاں پر آپ کے والد ماجد حضرت مولانا سید حبیب اللہ صاحبؒ خلیفہ و مجاز حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد دریابادی قدس سرہٗ اس زمانہ میں مدرس تھے۔ آپ کا تاریخی نام چراغ محمد رکھا گیا، آپ نسباً حسینی سید ہیں۔

مرکز علوم دارالعلوم دیوبند سے فراغت اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے شرفِ بیعت حاصل کرنے کے بعد ۱۳۱۶ھ میں جبکہ آپ کے والد ماجد نے بمعہ اہل و عیال حجاز مقدس مدینہ منورہ کو ہجرت فرمائی، تب حضرتِ اقدس کو بھی شرفِ معیت حاصل ہوا۔ اور حجاز مقدس پہونچ کر مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جوارِ رحمت میں اقامت فرما کر تدریس کی خدمت شروع کردی اور دس برس تک مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس حدیث دیتے دیتے رہے۔ اس طویل عرصہ میں ہزارہا تشنگانِ علوم دینیہ آپ سے سیراب ہوئے حرمین

نجد، حجاز اور دوسرے مقامات میں آپ کے تلامذہ کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہو گئی۔

۱۳۳۳ھ میں حضرت مولانا محمود الحسن شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بھی حجاز تشریف لے گئے اور حج سے فراغت کے بعد دیار نبوت میں حاضری دی۔ اسی عرصہ میں شریف حسین نے انگریزوں کی شاطرانہ اور پر فریب سازش میں آکر ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خدام اور رفقاء کی معیت میں اس موقع پر ترکوں کی حمایت کی اور سرحدی قبائل کو آراستہ کیا اور اسی سال انور پاشا اور جمال پاشا بھی اس وقت دربار رسالت میں حاضری کے لئے پہونچے۔

حضرت شیخ الہند نے ان کو نقشہ کار کی تشکیل میں بہت کچھ مدد پہونچائی اور حاجی ترنگ زئی، مولانا محمد میاں عرف مولانا محمد منصور، مولانا عبید اللہ سندھی اور دوسرے حضرات سے بھی اس سلسلہ میں بہت کچھ کام لیا گیا۔

قضاء الٰہی کہ انگریزوں کی چالیں کامیاب ہوئیں اور شیخ الہند مالٹا میں ساڑھے چار برس معہ دیگر رفقاء و تلامذہ جن میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رح بھی تھے، مقید رہے۔ ۲۲ رجمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ کو حضرت شیخ الہند مع اپنے خدام کے مالٹا سے رہا کئے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ہندوستان میں تحریک خلافت اور استخلاص وطن کی جدوجہد شروع ہو چکی تھی۔ حضرت مولانا مدنی اپنے شیخ محترم کی ہمرکابی میں ہندوستان تشریف لائے۔ اس وقت حکومت ترکی جو جنگ عظیم سے پہلے دُولِ عظمیٰ میں شمار ہوتی تھی اس کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اس کے ممالک محروسہ پر عمل جراحی کر کے ہر ایک حصہ جسم کو یورپ کے کفن فروشوں نے تقسیم کر لیا تھا۔ حجاز، عراق، شرق اردن کے علٰحدہ علٰحدہ

بنا کر برطانوی تولیت میں دیدیئے گئے تھے۔ حضرت شیخؒ کے نزدیک انگریزی حکومت سے ہندوستان کی آزادی ملتِ اسلامیہ کے نقطۂ نظر سے ممالک اسلامی کی آزادی کا واحد ذریعہ تھا۔ اس لئے حضرت اقدس ہندوستان ہی میں اقامت فرماکر مصروفِ کار ہوگئے اور کارکنانِ قضاء و قدر کے فیصلے کے مطابق حضرت شیخ الہند کی کامیابی کا سہرا آپ کے سر رہا۔ فللّٰہ الحمد والمنة۔

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی طلبی پر جبکہ انھوں نے کلکتہ میں ایک دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔ شیخ الہند نے اپنے بجائے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کو دارالعلوم کلکتہ کی صدارت کے لئے منتخب فرمایا اور آپ کو رخصت کرتے وقت شیخ الہند نے حضرت شیخ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لگایا سینے سے چمٹایا اور تمام بدن پر اس کو پھیرا اسوقت کا عالم ہی کچھ اور تھا جو ان ناسوتی آنکھوں سے وراء الوراء ہے۔ درحقیقت آپ کی مجاہدانہ زندگی، خلوص، ایثار، صداقت، حق پرستی، فراخ حوصلگی، بلند ہمتی، تواضع وخاکساری اور آپ کا علم و عمل، زہد و تقویٰ وغیرہ ایسے اوصاف کمال تھے کہ انھوں نے حضرت شیخ الہند کا حقیقی جانشین قرار دیا۔

ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف تحریک ترک موالات کا اہم واقعہ کراچی کا وہ تاریخی مقدمہ ہے جو زیر دفعہ ۱۲۰ و ۱۳۱ و ۵۰۵ تعزیرات ہند شیخ الاسلام، علی برادران، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد صاحب کانپوری اور سوامی شنکر اچاریہ پر چلایا گیا اور ان حضرات کو دو دو سال بامشقت سزا تجویز کی گئی تھی اور کراچی جیل میں ان کو رکھا گیا تھا۔ اس مقدمہ کی بنیاد حضرت شیخ الاسلام کی وہ تجویز تھی جو آپ نے آل انڈیا خلافت کانفرنس ۱۹۲۱ئہ میں پیش فرمائی تھی کہ موجودہ حالات میں مسلمانوں کے لئے

سرکاری فوج میں ملازم رہنا یا بھرتی ہونا یا دوسروں کو بھرتی کی ترغیب دینا حرام ہے مولوی محمد علی مرحوم اور دوسرے حضرات اس کی تائید یا اشاعت کے الزام میں ماخوذ تھے۔

الغرض یکم نومبر ۲۱ء کو اس تاریخی مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ بغاوت کے جرم سے ملزمین کو بری قرار دیا گیا۔ البتہ زیر دفعہ ۵۰۵ اور ۱۰۹ تعزیرات ہند حضرت شیخ الاسلامؒ اور آپ کے تمام رفقاء کو دو دو سال قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔

جیل خانوں میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا محبوب شغلہ قرآن حکیم اور مراحل سلوک رہا چنانچہ آپ مالٹا اور کراچی سے علم و تقویٰ کے ساتھ حفظِ قرآنِ عزیز کی دولت لے کر واپس آئے۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک تقریباً چھ سال آپ بنگال اور سلہٹ (آسام) کے جامعہ اسلامیہ میں شیخ الحدیث کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے واقعہ یہ ہے کہ اس علاقہ کی اصلاح کے لئے آپ کا قیام رحمت خداوندی اور تائید غیبی تھا۔ اس عرصہ میں آپ کا شغلہ درس و تدریس اور تبلیغ و اصلاح تھا۔ سلہٹ اور کچھاڑ وغیرہ کے اضلاع آپ کے اخلاص و ایثار سے متاثر ہو کر حلقہ ارادت میں داخل ہونے لگے۔ چنانچہ یہ علاقہ جہاں بیس سال پیشتر دو چار ہی عالم ہوں گے۔ بفضلہ تعالیٰ گلشن علم بن گیا دو درجن کے قریب عربی مدرسے صرف ضلع سلہٹ میں قائم ہو چکے ہیں۔

مرشدی و مولائی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ کے اوصاف اور اخلاق کا احاطہ اور حصر کا نہ یہ موقع ہے اور نہ میرے اندر اس کی قدرت اور طاقت ہے البتہ آپ کے اوصافِ کمال کے واقعات درج کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت والا ریل گاڑی میں سفر فرما رہے تھے۔ غالباً سیکنڈ کلاس میں اس ڈبہ میں ایک ہندو جنٹلمین بھی تھے۔ انھیں ضرورت قضائے حاجت لاحق ہوئی

وہ رفع حاجت کے لئے گئے اور الٹے پاؤں بادل نخواستہ واپس ہوئے حضرت مولانا مدنیؒ سمجھ گئے فوراً چند سگریٹ کے ٹوٹے ہوئے ڈبے اور پانی کا لوٹا لیکر اس پاخانہ میں گئے اور اچھی طرح اس کو صاف کر دیا اور پھر ہندو دوست سے فرمانے لگے کہ جائیے پاخانہ تو بالکل صاف ہے۔ شاید آپ کو رات کی وجہ سے صحیح اندازہ نہیں ہو سکا۔ اس نوجوان نے کہا کہ مولانا میں نے خوب دیکھا ہے پاخانہ گندا ہوا ہے' قصہ مختصر وہ اٹھا اور جا کر دیکھا تو پاخانہ بالکل صاف تھا۔ بہت ہی متاثر ہوا اور بھر پور عقیدت کے ساتھ عرض کرنے لگا' یہ حضور کی بندہ نوازی ہے جو سمجھ سے باہر ہے۔

ایک مرتبہ کسی گستاخ نے آپ کے پاس بخاری کے درس میں رقعہ بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے۔ آپ نے دوسری نشست میں نہایت نرم اور شائستگی سے جواب دیا اور فرمایا کہ کسی دوست نے مجھ کو رقعہ لکھا ہے کہ تو اپنے باپ سے نہیں ہے' اس کو سنکر تمام مجلس میں ہیجان برپا ہو گیا اور ہر ایک طالب علم غیظ و غضب میں بھر گیا۔ آپ نے فرمایا کہ غصہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا حق ہے کہ میں اس کی تسلی کر دوں۔ فرمایا کہ میں قصبہ ٹانڈہ محلہ اللہ پور کا رہنے والا ہوں۔ اس وقت بھی میرے والدین کے نکاح کے گواہ زندہ ہیں خط بھیجکر یا خود جا کر سمجھ لیا جائے۔ العظمۃ للہ علم اور بردباری کی انتہا ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے پہلوان وہ نہیں کہ جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے پر قابو رکھے اور اپنے نفس کو مغلوب کر دے۔

حضرت شیخ الاسلام پر گراں قدر شہادت نیز حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب بہت شریف طبیعت کے ہیں باوجود سیاسی اختلاف رکھنے کے بھی کوئی کلمہ خلاف حدود ان سے نہیں سنا گیا

فرماتے ہیں کہ میں اپنی جماعت میں مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے حسنِ تدبر کا اور مولانا حسین احمد صاحب کے جوش کا معتقد ہوں۔ ایک موقع پر حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کی مجلس خیر و برکت میں تحریکات وقت کا ذکر چھڑا۔ ایک صاحب نے حضرت مدنی کے کسی مجاہدانہ عمل کا حوالہ دیتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت آپ کا اس پر عمل نہیں فرمایا، بھائی میں ان جیسی (مفتی نہ مدنی جیسی) ہمت مردانہ کہاں سے لاؤں ؟

ایک موقع پر فرمایا کہ میں مولانا حسین احمد صاحب کو ان کے سیاسی کاموں میں مخلص اور متدین جانتا ہوں البتہ مجھے ان سے حجت کے ساتھ اختلاف ہے اگر وہ حجت رفع ہو جائے تو ان کے ماتحت ایک ادنیٰ سپاہی بن کر کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔

حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارن پور فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک حضرت حسین احمد کے فضل و کمال اور تبحر فی العلم والسلوک سے شاید ہی کسی اہل بصیرت کو اختلاف ہو اس ناکارہ کے نزدیک حضرت مدنی ہی رشد و ہدایت اور علم و فضل کے درخشاں آفتاب ہیں۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، حضرت مولانا حسین احمد فیض آبادی ثم المدنی آسمانِ علم و ہدایت کے آفتاب اور زہد و ورع میں یگانۂ زمانہ اور جہاد و تخلیص وطن کے ایک ممتاز شہسوار ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان ان کی ذات گرامی پر جس قدر بھی فخر کریں بجا ہے۔ وہ علَم ہدایت اور مستحق منصب قیادت ہیں ان کی مذہبی و وطنی خدمات سے تمام مسلمانانِ ہند واقف ہیں۔ اور انکے اخلاص و دیانت کے مخالف بھی معترف ہیں اور ان کی بے غرضانہ محبت کا لطف وہی حاصل کرسکتا ہے جو ان کی صحبت و معیت سے بہرہ ور رہا ہو۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی فرماتے ہیں:
شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے فضل و کمال اور مرتبہ و مقام پر گفتگو وہ کرے جو خود بھی کچھ ہو، مجھے ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدہ تو مولانا کے ایک ہی کمال اور ایک ہی کرامت کا ہے اور وہ آپ کی بے نفسی، سادگی، تواضع اور انکساری اور خدمت خلق کا عشق ہے۔ کہتا ہوں اور گویا کہ خانۂ شہادت میں کھڑا ہوا بیان دے رہا ہوں کہ وہ بہترین دوست ہیں، بہترین رفیق سفر ہیں۔ مہمان ہو جئے تو آپ کی میزبانی میں اپنے معمولات تک ترک کر دیں گے۔ روپیہ پیسہ کی ضرورت پیش آجائے تو خود قرضدار ہو جائیں گے لیکن آپ کی حاجت کہیں سے ضرور پوری کریں گے۔ خدانخواستہ بیمار پڑ جائیے تو تیمارداری میں دن رات ایک کر دیں گے۔ نوکری کی ضرورت پیش آجائے کوئی مقدمہ کھڑا ہو کسی امتحان میں بیٹھ جائیے تو سفارش ناموں میں اور عملی دوڑ دھوپ میں نہ اپنے مرتبہ کا لحاظ کریں گے نہ اپنی صحت کا اور نہ خرچ کا جس طرح بھی ہوگا آپ کا کام نکلنے پر تل جائیں گے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ معاملہ جو بھی رکھتے ہوں۔ اپنے خورد، شاگردوں اور مریدوں کے ساتھ روش یہ رکھتے ہیں کہ خادم کو مخدوم ہی بنا کر چھوڑتے ہیں۔ حالی کے شعر کے معنی اب جاکر روشن ہوئے ہیں۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت

سنا ہے کہ یہ شان حضرت مولانا محمود الحسن شیخ الہند دیوبندی کی تھی۔ اگر صحیح ہے تو جانشینی کا حق ان سے زائد کسی کو نہیں پہونچتا۔ فرصت میسر آتی تو اس متن کی شرح بھی اپنے قلم سے کرتا اور نوبت شرح پر حواشی کی آتی، اور ایک۔

مختصر المعانی پر کئی کئی مفصل اور مطول تیار ہو جاتے ہے

سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے

حضرت شیخ مدنی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے معمولات اور مشاغل تصوف اور سلوک کی روح معمولات پر مداومت ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: احب الاعمال عند اللہ ادومہا یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ اعمال وہ ہیں۔ جن پر مداومت کی جائے

دوسری حدیث ہے: عن مسروق قال سألت عائشۃ ای العمل احب الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قالت الدایم۔ حضرت مسروق کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ حضورؐ کو کونسا عمل زیادہ پسند تھا، فرمایا جو عمل پابندی سے ہوتا رہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے معمولات پر نہایت سختی سے پابند تھے۔ نماز باجماعت کی اسقدر پابندی کہ سفر میں حضر میں جلسہ کے اسٹیج پر ہوں یا ریلوے کے پلیٹ فارم پر نماز کا وقت آیا اور نماز کے لئے جماعت کے ساتھ حق تعالیٰ کے حضور میں موجود۔ حضرت اقدس کے اہم اور خاص معمولات میں آخر شب میں صلوٰۃ تہجد اور الحاح وزاری ہے۔ جب تک آپ بقید حیات دنیا میں رہے۔ اس معمول میں فرق نہیں آیا۔ سفر میں، حضر میں جیل میں اور مکان پر ہر حالت میں اس معمول پر نہایت سختی سے پابند رہے۔ چنانچہ ہزارہا مرتبہ ایسا ہوا کہ رات کو دو دو بجے تک آپ کی تقریر کا سلسلہ جاری رہتا۔ تمام لوگ بستروں کا رخ کرتے اور یہ اللہ تعالیٰ کا پیارا بندہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ دیوبند قیام کے زمانہ میں درس حدیث سے ۱۲ بجے رات کو فارغ ہونے

کے بعد جب مکان تشریف لاتے تو عموماً ایک بجے تک کتاب کا مطالعہ فرماتے تھے تھوڑی دیر کے لئے استراحت فرمائی اور کمر سیدھی کی اور پھر دو تین بجے نماز تہجد کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے، نماز سے فارغ ہو کر نہایت گریہ وزاری کے ساتھ دعا میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اور رات کا آخری حصہ اکثر گریہ وزاری، توبہ، استغفار میں گذار دیتے تھے۔ کبھی کبھی پوربی زبان کے یہ اشعار پڑھتے اور روتے جاتے تھے۔

پیا کی یاد ستائے موری ناری ناری[1]

مکہ میں ڈھونڈا مدینہ میں ڈھونڈا میں پھری بیت اللہ کے یاری یاری[2]

پیا کی یاد ستائے موری ناری ناری

صبح کی نماز جماعت سے ادا فرما کر حضرت اندر تشریف لے جاتے تھے، اور تلاوت قرآن یا کسی حدیث کی کتاب کا مطالعہ فرماتے، اشراق کے بعد مہمان خانہ میں تشریف لاتے اور مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر نانِ خبینہ تناول فرماتے اور چائے پیتے اور کچھ دیر مہمانوں کے ہمراہ گفتگو فرماتے اور اندر حویلی میں تشریف لیجا کر دس بجے تک مطالعہ میں مشغول رہتے، اس کے بعد درس کے لئے دار الحدیث میں تشریف لیجاتے، وہاں سے بارہ بجے فارغ ہو کر مہمانوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا تناول فرماتے اور دوپہر کو تھوڑی دیر قیلولہ فرماتے، پھر نماز ظہر سے فارغ ہونے کے بعد تقریباً عصر تک مہمان خانہ ہی میں تشریف فرما رہتے اور اس وقت مریدین وسالکین اور اہل حوائج کے احوال سن کر ان کے حسب حال اوراد و وظائف کی تلقین اور ضرورت مندوں کی ضروریات کی طرف توجہ فرماتے تھے عصر کے بعد پھر مجلس ہوتی تھی اور یہی سلسلہ مغرب تک جاری رہتا تھا، مغرب کی نماز کے بعد نوافل میں سوا یا ڈیڑھ پارہ پڑھنے کا ہمیشہ معمول رہا۔ اس کے بعد بیعت ہونیوالوں

کو بیعت کرتے تھے اور عشا کی اذان کے وقت مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے تھے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر آپ اندر تشریف لے جاتے اور تھوڑی دیر مطالعہ فرما کر درس حدیث کے لئے دار الحدیث تشریف لے جاتے اور تقریباً ۲ بجے تک پڑھاتے رہتے تھے۔

رمضان المبارک میں ثلث لیل گزرنے پر تراویح کے لئے کھڑے ہو جاتے اور تقریباً ایک بجے تک یہی سلسلہ جاری رہتا تھا۔ دو بجے سے تہجد کے لئے کھڑے ہو جاتے اور سحری سے تھوڑی دیر پہلے ختم فرما دیتے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد مجلس رہتی تھی جس میں سالکین کے احوال سننے اور ان کی تربیت فرمانے کا مشغلہ رہتا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد سے مغرب تک قرآن شریف کا دور فرماتے تھے۔

آسام کے قیام میں ایک جدید مجلس تراویح اور تہجد کے درمیان اور بھی ہوتی تھی، جس میں حضرت والا مہمانوں کے سامنے وہاں کے پھل پیش فرماتے اور خود بھی تناول فرماتے تھے۔

مدینہ منورہ کے معمولات میں اتنا اضافہ اور ہوتا تھا کہ صبح کی نماز اور عشاء کی نماز کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مزار مقدس پر حاضری دیتے اور تقریباً گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک کھڑے ہو کر درود و صلوٰۃ پڑھتے رہتے تھے۔ دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ حضرت اقدس باوجود ضعف اور معمر ہونے کے اس طرح کھڑے رہتے تھے کہ پیروں کو جنبش تک نہیں ہوتی تھی۔ درحقیقت اس زندگی کا نام تصوف ہے اور یہ ہے حضرتِ اقدس کا مقام تصوف کاش حق تعالیٰ ہم نالائقوں کو اس کا تھوڑا سا حصہ بھی عنایت فرما دے۔

زندہ کرامت | اولیاء اللہ کی کرامت برحق ہے۔ اس سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا

لیکن ولایت اور کرامت کا جو مفہوم عام ذہنوں کا محدود بنا ہوا ہے وہ یقیناً دین الٰہی کے نزدیک ضلالت اور کھلی ہوئی گمراہی ہے۔ کرامت صرف وہی معتبر ہے جو شریعت کے ماتحت صادر ہو نہ وہ کہ جس کی ہر ایک حرکت سے مذہب بے زار اور عقل ماتم کناں ہو۔

حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی تبلیغی، تدریسی خدمات اور اتباع سنت وغیرہ فوق العادت روحانی قوت اور عزیمت، راتوں کو مسلسل تقریریں صبح کو درس گاہ میں پہونچ کر کئی کئی گھنٹے ڈھائی سو طلباء کو درس دینا پھر اسی طرح بعد ظہر بعد عصر اور بسا اوقات بعد عشاء ایک دو دن نہیں بلکہ ہمیشہ یہ قدرتی مشین چلتی رہتی ہے۔ یہ زندہ کرامت نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

ہوا میں اڑنا، پانی پر چلنا زیادہ دشوار نہیں اس لئے کہ پرند اڑتے ہیں اور مچھلیاں تیرتی ہیں، سونا چاندی بنا دینا اور قلب ماہیت کر دینا مشکل نہیں اس لئے کہ ایک کیمیا گر اس کو جانتا ہے۔ غیب کی خبریں دینا کوئی کمال نہیں اس لئے بعض اوقات مالیخولیا کا مریض بھی غیب کی خبریں بتا دیتا ہے۔ ہاں اگر مشکل اور سخت مشکل ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر زندگی گذارنا ہے کیونکہ اتباع سنت کے میدان میں لرزہ خیز طوفانوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ مگر افسوس آج کل لوگوں کا مزاج ایسا بگڑ گیا ہے کہ اتباع سنت کو کرامت ہی نہیں سمجھا جاتا۔ کسی بزرگ کی سب سے بڑی کرامت اخلاق نبوت اور اتباع سنت میں ہے یہی وہ معیار ہے کہ اس پر اگر کوئی صحیح اترتا ہے تو وہ بزرگی اور کرامت بزرگ ہے ورنہ رد کرنے کے لائق ہے حضرت شیخ مدنیؒ کی ذات گرامی کو جب اس معیار پر جانچا جاتا ہے تو وہ جواہرات سے زیادہ آب و تاب میں نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ درحقیقت حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ حق تعالیٰ کے محبوب اور پیارے بندے تھے اور وہ آج بھی قرب الٰہی کے بلند مقامات پر فائز ہیں، حق تعالیٰ ہمیں اور سب مسلمانوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین یا رب العالمین

سلاسلِ طیّبہ ۱۳۸۳ھ

یعنی

شجرات چشتیہ و قادریہ و نقشبندیہ و سہروردیہ رحمہم اللہ تعالیٰ

چونکہ دعاؤں میں توسل کرنا خواہ اعمالِ صالحہ سے ہو یا عاملین صالحین سے اولیاء اللہ سے ہو یا انبیاء سے ملائکہ مقربین سے ہو یا اسماء و صفاتِ الٰہیہ سے اجابت میں بہت زیادہ مفید اور مؤثر اور سلف صالحین کا معمول بامر ہے اس لئے ان شجروں کو اسی طریق توسل پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اولاً شجرہ چشتیہ صابریہ ذکر کیا گیا ہے کیونکہ ہمارے مشائخ قدس اللہ اسرارہم کا اصل سلوک اسی طریقہ میں اور یہ نسبت ان میں دیگر نسبتوں پر غالب تر ہے۔ اس کے بعد قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ کو ذکر کیا ہے۔ تاکہ جو بھی شجرہ پسند خاطر ہو اس کو پڑھ کر برکت حاصل کی جائے۔

شجرۂ مبارکہ حسینیہ قدوسیہ چشتیہ صابریہ قدس اللہ اسرارہم

اَللّٰھُمَّ بِوَسِیْلَۃِ راس العُلماء والصلحاء سیّدنا ومُرشِدِنا مولانا سیّد حسین احمد المدنی قدس اللہ سرہ العزیز

اَللّٰھُمَّ بِجَاہِ قُطْبِ الزَّمَانِ سَیِّدِنَا وَمُرْشِدِنَا مَوْلَانَا رَشِیْد اَحْمَد الْگَنْگُوھِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ مَوْلَانَا الْحَاجِ الْحَافِظِ الشَّیْخِ اِمْدَادِ اللہِ الْمُھَاجِرِ قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا نُوْر مُحَمَّد الْجَھنجھانوی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا الشَّاہِ عَبْدِ الرَّحِیْمِ الشَّھِیْدِ قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا عَبْدِ الْبَارِی الْاَمْرُوھِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا عَبْدِ الْھَادِی الْاَمْرُوھِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا عَضُدِ الدِّیْنِ الْاَمْرُوھِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا الشَّیْخِ مُحَمَّدِ الْمَکِّی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا الشَّاہِ مُحَمَّدِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا مُحِبِّ اللہِ اِلٰہ آبَادِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا اَبِی سَعِیْدِ الْگَنْگُوھِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا نِظَامِ الدِّیْنِ الْبَلْخِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا جَلَالِ الدِّیْنِ التھانیسری قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا قُطْبِ الْعَالَمِ الشَّیْخِ عَبْدِ الْقُدُّوْسِ الْگَنْگُوھِی قَدَّسَ اللہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ الْعَارِفِ الرَّدَوْلَوِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَحْمَدَ الْعَارِفِ الرَّدَوْلَوِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الشَّیْخ عَبْدِ الْحَقِّ الرَّدَوْلَوِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا جَلَالِ الدِّیْنِ کَبِیْرِ الْاَوْلِیَآءِ الْپَانِیْپَتِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا شَمْسِ الدِّیْنِ التُّرْکِ الْپَانِیْپَتِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا وَسَیِّدِ الْعَارِفِیْنَ عَلَاءِ الدِّیْنِ عَلِیٍّ اَحْمَدَ الصَّابِرِ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا فَرِیْدِ الدِّیْنِ شَکَرْ گَنْجِ الْاَجُوْدَهَنِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا قُطْبِ الدِّیْنِ بَخْتِیَارِ الْکَاکِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا قُطْبِ الْعَالَمِ اِمَامِ الزَّمَانِ مَرْکَزِ الطَّرِیْقَةِ مُعِیْنِ الدِّیْنِ
حَسَنِ السَّنْجَرِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الشَّیْخ عُثْمَانِ الْهَارُوْنِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الْحَاجِّ السَّیِّدِ الشَّرِیْفِ الزَّنْدَنِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا مَوْدُوْدِ الْچِشْتِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِیْ یُوْسُفَ الْچِشْتِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِیْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُحْتَرَمِ الْچِشْتِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِیْ اَحْمَدَ الْاَبْدَالِ الْچِشْتِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِیْ اِسْحَاقَ الشَّامِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا مُمْشَادْ عَلْوِ الدِّیْنَوَرِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِیْ هُبَیْرَةَ الْبَصْرِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا حُذَیْفَةَ الْمَرْعَشِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا السُّلْطَانِ اِبْرَاھِیْم بْنِ اَدْھَم الْبَلْخِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا فُضَیْلِ بْنِ عِیَاضٍ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا عَبْدِ الْوَاحِدِ بْنِ زَیْدٍ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا الْخُواجَہ حَسَن الْبَصْرِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ سَیِّدِنَا مَدِیْنَةِ الْعِلْمِ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیِّ بْنِ اَبِی طَالِبٍ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ
وَبِجَاہِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ اَحْمَدَ الْمُجْتَبٰی مُحَمَّدِ نِ الْمُصْطَفٰی
صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلَّمَ ۔

شجرہ مبارکہ حسینیہ قدوسیہ قادریہ قدس اللہ اسرارہم

اَللّٰھُمَّ بِجَاہِ قُطْبِ الزَّمَانِ سَیِّدِنَا وَمُرْشِدِنَا مَوْلَانَا رَشِیْد اَحْمَدَ الْکَنْکَوْھِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا الْحَاجِّ الْحَافِظِ الشَّیْخ اِمْدَادُ اللّٰہِ الْمُھَاجِر قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا نُوْر مُحَمَّدِ الْجِھِنْجِھَانْوِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا عَبْدِ الرَّحِیْمِ الشَّھِیْد قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا عَبْدِ الْبَارِی الْاَمْرُوْھِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا عَبْدِ الْھَادِی الْاَمْرُوْھِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا عَضُدِ الدِّیْنِ الْاَمْرُوْھِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَایِخِ سَیِّدِنَا الشَّیْخ مُحَمَّدِ نِ الْمَکِّی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا الشَّاهِ مُحَمَّدِيْ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا مُحِبِّ اللّٰهِ الْإِلٰهِ آبَادِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا أَبِيْ سَعِيْدِنِ الْگَنْگُوْهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا نِظَامِ الدِّيْنِ الْبَلْخِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا جَلَالِ الدِّيْنِ التَّهَانِيْسَرِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا قُطْبِ الْعَالَمِ عَبْدِ الْقُدُّوْسِ الْگَنْگُوْهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ قَاسِمِ الْأَوْدِهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا السَّيِّدِ بُدَّهَنِ الْبَهْرَائِچِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا الْمَخْدُوْمِ جَهَانِيَانِ جَهَانْ گَشْتْ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا السَّيِّدِ جَلَالِ الدِّيْنِ الْبُخَارِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا عُبَيْدِ بْنِ عِيْسٰى قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا عُبَيْدِ بْنِ أَبِي الْقَاسِمِ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا أَبِي الْمَكَارِمِ الْفَاضِلِ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا قُطْبِ الدِّيْنِ أَبِي الْغَيْثِ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا شَمْسِ الدِّيْنِ عَلِيِّ أَفْلَحَ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا شَمْسِ الدِّيْنِ الْحَدَّادِ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا إِمَامِ الْأَوْلِيَاءِ الشَّيْخِ مُحْيِ الدِّيْنِ عَبْدِ الْقَادِرِ الْجِيْلَانِيِّ
قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَايِخِ سَيِّدِنَا أَبِيْ سَعِيْدِنِ الْمَخْزُوْمِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِی الْحَسَنِ الْقَرْشِیِّ عَلِیِّ الْهَکَّارِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِی الْفَرَحِ الطَّرْطُوْسِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا عَبْدِ الْوَاحِدِ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ التَّمِیْمِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِی بَکْرِنِ الشِّبْلِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الْجُنَیْدِ الْبَغْدَادِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا السَّرِیِّ السَّقْطِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الْمَعْرُوْفِ الْکَرْخِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا دَاؤدَ الطَّائِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا حَبِیْبِنِ الْعَجَمِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الْاِمَامِ الْحَسَنِ الْبَصْرِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ سَیِّدِنَا عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْهَہٗ
وَبِجَاہِ سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ طَهِّرْ قَلْبِیْ عَمَّا سِوَاكَ وَنَوِّرْہُ بِاَنْوَارِ عِشْقِكَ وَمَعْرِفَتِكَ وَوَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّہٗ وَتَرْضَاہُ وَارْضَ عَنِّیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ یَاکَرِیْمُ

شجرہ مبارکہ نقشبندیہ مجددیہ حسینیہ قدس اللہ اسرارہم

اَللّٰهُمَّ بِجَاہِ قُطْبِ الزَّمَانِ سَیِّدِنَا وَمُرْشِدِنَا وَمَوْلَانَا رَشِیْدِ اَحْمَدَ الْگَنْگُوْهِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا الْحَاجِّ الْحَافِظِ اِمْدَادِ اللّٰہِ الْمُهَاجِرِ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْزَ

وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا میاں جی نور محمد شاہ قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ مولانا السید احمد الشہید البریلوی قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الشاہ عبد العزیز الدہلوی قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الشاہ ولی اللہ الدہلوی قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الشاہ عبد الرحیم الدہلوی قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الشاہ السید عبد اللہ قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا السید آدم البنوری قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الامام الشیخ احمد المجدد للالف الثانی قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ باقی باللہ قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ امکنکی قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا ومولانا الدرویش قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا ومولانا زاہد قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ عبید اللہ الاحرار قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ یعقوب الچرخی قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ علاء الدین العطار قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ بہاء الدین النقشبند قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ السید امیر کلال قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ محمد بابا السماسی قدس اللہ سرہ العزیز
وبجاہِ شیخ المشائخ سیدنا الخواجہ علی رامیتنی قدس اللہ سرہ العزیز

وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ مَحْمُود اِبی الْخَیر الفغنوی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ مُحَمَّد بِن العَارِف قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا رِیوگَرِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ عَبْدِ الْخَالِقِ الْغُجدوَانِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ یُوسُف الْهَمدَانِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ اَبِی عَلِی بِن الْفَارمدِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ اَبِی الْقَاسِمِ الْقُشَیرِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ اَبِی عَلِی بِن الدَّقَّاقِ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ اَبِی الْقَاسِمِ النَّصِیرآبَادِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ اَبِی بَکْر بِن الشِّبلِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا سَیِّدِ الطَّائِفَۃِ الْجُنَیدِ الْبَغْدَادِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا السَّرِیِ السَّقَطِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الشَّیخ مَعْرُوفِ الْکَرْخِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا دَاؤد الطَّائِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الخواجہ حَبِیبِ نِ الْعَجَمِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اِمَامِ الْاَوْلِیَآءِ حَسَنِ الْبَصْرِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیز
وَبِجَاهِ شَیخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِ الْاَوْلِیَآءِ اَمِیرِ الْمُؤْمِنِینَ عَلِی کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْهَہٗ
وَبِجَاهِ سَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِینَ سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ
طَهِّرْ قَلْبِی عَمَّا سِوَاکَ وَنَوِّرْہُ بِاَنْوَارِ مَعْرِفَتِکَ عِشْقِکَ وَوَفِّقْنِی لِمَا تُحِبُّ
وَتَرْضَاہُ وَارْضَ عَنِّی فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ یَا کَرِیْمُ

شجرۂ مبارکہ حسینیہ قدوسیہ سہروردیہ قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم

اللّٰهُمَّ بِجَاهِ قُطْبِ الزَّمَانِ سَيِّدِنَا وَمُرْشِدِنَا وَمَوْلَانَا رَشِيْدِ اَحْمَدَ الْگَنْگُوْهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا الْحَاجِّ الْحَافِظِ اِمْدَادِ اللّٰهِ الْمُهَاجِرِ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا نُوْرِ مُحَمَّدِ نِ الْجِهْنْجِهَانَوِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا عَبْدِ الرَّحِيْمِ الشَّهِيْدِ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا عَبْدِ الْبَارِيِّ الْاَمْرُوْهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا عَبْدِ الْهَادِيِّ الْاَمْرُوْهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا عَضُدِ الدِّيْنِ الْاَمْرُوْهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ نِ الْمَكِّيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا الشَّاهِ مُحَمَّدِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا مُحِبِّ اللّٰهِ الْاِلٰهٰ اٰبَادِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا اَبِيْ سَعِيْدِ نِ الْگَنْگُوْهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا نِظَامِ الدِّيْنِ الْبَلْخِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا جَلَالِ الدِّيْنِ التَّهَانِيْسَرِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا قُطْبِ الْعَالَمِ عَبْدِ الْقُدُّوْسِ الْگَنْگُوْهِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا السَّيِّدِ اَجْمَلِ الْبَهْرَائِجِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاهِ شَيْخِ الْمَشَائِخِ سَيِّدِنَا السَّيِّدِ جَلَالِ الدِّيْنِ الْبُخَارِيِّ قَدَّسَ اللّٰهُ سِرَّهُ الْعَزِيْزَ

وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا رُکْنِ الدِّیْنِ اَبِی الْفَتْحِ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا صَدْرِ الدِّیْنِ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الشَّیْخِ بَھَاءِ الدِّیْنِ زَکَرِیَّا الْمُلْتَانِی قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اِمَامِ الطَّرِیْقَۃِ الشَّیْخِ شِھَابِ الدِّیْنِ السُّھْرَوَرْدِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا ضِیَاءِ الدِّیْنِ اَبِی النَّجِیْبِ السُّھْرَوَرْدِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا وَجِیْہِ الدِّیْنِ عَبْدِ الْقَاھِرِ السُّھْرَوَرْدِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَبِی مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَحْمَدَ الدِّیْنَوَرِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا مَمْشَادِ عَلُوِّ الدِّیْنَوَرِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الْجُنَیْدِ الْبَغْدَادِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا السَّرِیِّ السَّقَطِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا مَعْرُوْفِ الْکَرْخِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا دَاؤدَ الطَّائِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا الْخَوَاجَہ حَبِیْبِ الْعَجَمِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اِمَامِ الْاَوْلِیَاءِ حَسَنِ الْبَصْرِیِّ قَدَّسَ اللّٰہُ سِرَّہُ الْعَزِیْز
وَبِجَاہِ شَیْخِ الْمَشَائِخِ سَیِّدِنَا اَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلِیٍّ کَرَّمَ اللّٰہُ وَجْھَہٗ ط
وَبِجَاہِ سَیِّدِ الْعَالَمِیْنَ اِمَامِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ طَھِّرْ
قَلْبِیْ عَمَّا سِوَاکَ وَنَوِّرْہُ بِاَنْوَارِ مَعْرِفَتِکَ وَعِشْقِکَ وَوَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّہٗ وَتَرْضَاہُ
وَارْضَ عَنِّیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ یَا کَرِیْمُ ط

مقاماتِ تصوّف

تصنیف

اُستاذ العلماء حضرت مولٰنا الحاج محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی
شیخ الحدیث جامعہ عربیہ آنند (گجرات)

یونیورسل بکس ○ ۴۰۔ اے اُردو بازار ◎ لاہور